ماھنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

FEBRUARY - 1988

طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح متوجہ ہوں

برادر محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ اس سے قبل مجلہ "حیات نو" اور دعوت نامے کے ذریعہ آپ کو یہ اطلاع دی جا چکی ہے کہ انجمن طلبۂ قدیم کا چوتھا دو سالہ اجلاس ان شاء اللہ تعالیٰ ۱۲، ۱۳، ۱۴ فروری ۱۹۸۸ء کو جامعہ کے احاطہ میں ہوگا۔ جس وقت آپ کو یہ شمارہ ملے گا اس وقت اجلاس کے انعقاد میں چند ایام رہ گئے ہوں گے۔ اس سلسلے میں آپ حضرات کی توجہ خصوصی طور پر چند امور کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

۱۔ چونکہ یہ اجلاس پورے تین سال کے بعد ہو رہا ہے، اس لئے شرکت کی ہر ممکن کوشش کیجئے اور اگر کوئی دشواری ہو تو ہم سے ربط قائم کیجئے۔

۲۔ بار بار متوجہ کرنے کے باوجود ابھی تک بہت سے اراکین انجمن و حیات نو کے لئے تجاویز و مشورے ہمیں نہیں مل سکے ہیں لہٰذا انھیں تحریر کر کے فوراً روانہ کرنے کی زحمت کریں، بصورت دیگر اپنے ساتھ لانے کی لازماً کوشش کریں۔

۳۔ سیمینار میں جن حضرات کو دعوت نامے ارسال کئے گئے تھے تقریباً سب ہی کی منظوری ہم کو مل گئی ہے۔ جامعہ اور انجمن کے لئے یہ اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام ہے لہٰذا اسے کامیاب بنانے کی کوشش کیجئے۔ اس کی بہترین شکل یہ ہے کہ آپ کی شرکت لازماً ہو۔ دوسرے ساتھیوں پر بھی زور دے کر تشریف لائیں۔

۴۔ موسم کے لحاظ سے بستر ساتھ لائیں۔ رجسٹریشن فیس دس روپے ہوگی۔

۵۔ اجلاس کی کامیابی کے لئے خصوصی دعا کا اہتمام فرمائیں۔

والسلام

انصار احمد فلاحی

ناظم اجلاس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیات نو

جلد نمبر ۳ — شمارہ نمبر ۲

فروری ۱۹۸۸ء

● مدیر منتظم — نور محمد فلاحی

● مدیر — طارق فاروق قلیط فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

● سالانہ زر تعاون	۳۰ روپے
● خصوصی تعاون	۱۰۰ روپے
● غیر ممالک سے	۱۵ امریکی ڈالر
● فی شمارہ	۳ روپے

پتہ ترسیل زر کا: دفتر ماہنامہ مجلہ حیات نو۔ جامعۃ الفلاح۔ بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی ۲۷۶۱۲۱

انصاف تعلیمی پریس، بستی حضرت نظام الدین، دہلی — کاتب: رفیق احمد شاہ پوری

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ

ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بار فلاح	ولی اللہ سعیدی فلاحی	۳

بحث و نظر

مطالعۂ قرآن	مرتب: عبد البر اثری متعلم جامعہ	۸
نسخ ہندی کے احکام	جناب مفتی عبد الرؤف صاحب۔ استاذ جامعہ	۳۳

مقالات

ابوالاعلیٰؒ کا نثری سرمایہ	صباح الدین فلاحی	۱۵
اقبالؒ کی نظر میں عورت کا مقام	شریف احمد مبارکپوری	۲۲
سید قطب شہید کا نظریۂ اعجاز القرآن	مسیح الزمان فلاحی	۲۵

عظمت کے مینار

حضرت عمرو بن جموحؓ	ابوجدید۔ استاذ جامعہ	۳۴

انٹرویو

جناب پروفیسر محمد سلیم صاحب سے چند سوالات	ادارہ	۱۷

تصویرِ جہاں

روداد سہ شنبۂ الوداع	جناب قاضی زین العابدین صاحب۔ استاذ جامعہ	۴۱

شعر و نغمہ

غزلیں	قمر سیوانی، مجاہد کلیم پوری، عبد الشکور عدال	۳۲، ۵۱، ۶۰
آدمی	مجاہد کلیم پوری	۳۳

تعارف و تبصرہ

"موضوع اور ضعیف حدیثوں کا چلن" اور "ہفت روزہ ظہورِ اسلام"	ولی اللہ سعیدی فلاحی	۵۷

جامعہ کے لیل و نہار

جناب ماسٹر عبد المالک صاحب کو وداعی پارٹی	ولی اللہ سعیدی فلاحی	۶۰

اداریہ — ولی اللہ سعیدی فلاحی

ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بار فلاح

علم کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔ علم کی دولت تمام دولتوں سے عظیم اور برتر ہے۔ یہ وہ دولت ہے جس کے سامنے سونے اور چاندی کے ڈھیر کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ایک بینا عالم اپنی بصیرت کی آنکھوں سے ہزاروں میل دور خزانے کے نقوش دیکھ لیتا ہے لیکن ایک جاہل آنکھیں رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ "الجہل عمی وظلمۃ" عالم اور جاہل کے اسی فرق کو قرآن نے خود ان الفاظ میں بیان کیا ہے: هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون، دوسری جگہ ہے: هل يستوي الأعمى والبصير۔

آج دنیا میں سائنس کی بدولت بے شمار ترقیاں ہو چکی ہیں۔ آج انسان دور دراز علاقوں سے بولنے والے اور ان کی گفتگو گھر بیٹھے سن سکتا ہے نہیں بلکہ اب وہ ان کی تصویر بھی دیکھ سکتا ہے، پرندوں کی طرح آسمان میں اڑ سکتا ہے، مچھلیوں کی طرح سمندروں میں تیر سکتا ہے، مزید برآں وہ عام انسانوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ذہین لگنے والی مشین ایجاد کر سکتا ہے جو زندگی کی جملہ ضروریات بحسن و خوبی انجام دے سکتی ہے۔ اسی لئے آج کا انسان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ علم کی اعلیٰ منزلیں طے کر چکا ہے اور علم کا اصل سرمایہ اسی کے پاس ہے۔

لیکن علم و جہل کا یہ تنگ معیار درست نہیں ہے جو آج کے انسان کے پاس ہے بلکہ حقیقی عالم وہ ہے جو اپنے آپ کو اور اپنے بنانے والے کو جان لے۔ علم کی بنیادی اساس یہ چیز ہے جس کے ذریعہ آدمی اپنے خدا تک پہنچ سکے۔ اس کے برعکس جو شخص خود کو اور اپنے خالق کو نہ پہچان سکے اس سے بڑا جاہل کوئی نہیں ہو سکتا۔

آج کے انسان نے کرۂ ارض میں دور آفتاب و ماہتاب اور ستاروں و سیاروں کی حقیقت تو معلوم کر لی لیکن وہ اپنی حقیقت سے معلوم نہیں کر سکا۔ اس نے اس وسیع و عریض خلا کا سفر تو طے کر لیا لیکن یہ

حقیقت ہے کہ وہ اپنے افکار کی دنیا پر سفر کر سکا اور اپنی جہالت کی بنا پر یہ کہہ بیٹھا آئینہ پہ گرا آئینہ گر نہیں۔

اصل علم یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو پہچانے، کائنات کی حقیقت کو جانے اور اپنے خالق کو ملے۔ اسی چیز کو سکھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلے اللہ علیہ وسلم تک پیغمبروں کا لا متناہی سلسلہ جاری فرمایا جو مختلف زمانوں اور قوموں میں آتے رہے اور قدم قدم پر ان کی صحیح طور کی رہنمائی کرتے رہے۔ آخر میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، آپ سے پہلے کوئی نبی اپنے کو پیغمبر و معلم کی حیثیت سے اس طرح نہ لایا، آپ نے خود ارشاد فرمایا: بعثت معلما۔

اس علم کو سیکھنے اور سکھانے والوں کی بڑی فضیلت آئی ہے کیونکہ یہی وہ علم ہے جو مطلوب و مقصود ہے۔ اسی علم کے ذریعہ ابدی کامیابی ممکن ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے علوم کو علم کہا جاتا ہے، یہ دولت کی رہنمائی کو نظر انداز کر کے خدا کے وجود کی رہنمائی نہ کر سکیں یقیناً گمراہ کن ہیں۔ اس علم کی اہمیت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے سمجھ میں آتی ہے، فرمایا: طلب العلم فریضۃ "علم دین" آپ نے اس علم کے حاصل کرنے کو جہاد فی سبیل اللہ کے مترادف قرار دیا کہ جو اس راہ میں محنت کرتے ہوئے مر جائے وہ شہید ہے۔

تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ بحمد اللہ ہر دور میں جاری رہا اور مختلف ممالک میں اس غرض سے جامعات اور مدارس کا قیام عمل میں آیا جن میں اس علم کا اہتمام کیا گیا۔ ہمارے ملک بھارت میں جب مسلمان سیاسی اقتدار سے محروم ہو گئے اور انگریزوں نے منصوبہ بند طریقے سے اسلام اور مسلمانوں پر حملہ کیا تو اس وقت ہمارے ملک میں بھی اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ایسے مدارس کا قیام عمل میں لایا جائے جن میں یہ علم رواج پائے اور مسلمانوں کو ان کی وراثت سے روشناس کیا جائے۔ چنانچہ دیوبند، سہارنپور، سورت اور حیدرآباد جیسی جگہوں پر دینی تعلیم گاہوں کا نظم کیا گیا لیکن چونکہ ہمارے بھارت میں دو قسم کے لوگ موجود تھے ایک وہ جو سکولر ذہن کے تھے اور دوسرے وہ جو خالص مذہبی، اس لئے یہ تعلیم گاہیں ہمارے ملک میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جہاں قرآن و حدیث اور فقہ و تاریخ پر گہری نظر کی ضرورت تھی وہیں سکولر ذہن رکھنے والے لوگوں کے رجحانات و نظریات سے واقفیت رکھنے

کے لئے علوم عصریہ کی بھی ضرورت تھی تاکہ اسلام دشمن عناصر کے اعتراضات کا جواب دیا جا سکے اور اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ واپس لایا جا سکے۔ لوگوں نے اس کمی کو محسوس کیا اور لکھنؤ میں ایک ادارے کے قیام کا فیصلہ کیا۔ بحمد اللہ یہ ادارہ اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیاب رہا اور اسکی خدمات قابل قدر ہیں۔

اس عظیم مقصد کے چند دیوانوں اور تشنگان علم کے پروانوں کو فکر دامن گیر ہوئی کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جہاں قرآن و حدیث، فقہ و تاریخ اور ادب و فلسفہ کے ساتھ ساتھ انگریزی، ہندی، عربی، فارسی، تاریخ و جغرافیہ، ابتدائی سائنس و مبادیات اور سیاسیات و معاشیات جیسے علوم بھی داخل نصاب ہوں تاکہ یہاں سے تعلیم یافتہ افراد دینی اور عصری علوم کا گہرا درک حاصل کر سکیں اور باطل نظریات کی کاٹ کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔

لہٰذا اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں بلریا گنج میں مطلوبہ ادارے کا قیام عمل میں آیا اور اس کا نام "جامعۃ الفلاح" رکھا گیا۔ اس کے دستور میں بھی باقاعدہ مطلوبہ امور کی نشاندہی کر دی گئی۔ جامعہ کے دستور میں "جامعہ کے اغراض و مقاصد" کچھ اس طرح ہیں:

۱: ایسے افراد فراہم کرنا (الف) جو قرآن و سنت کا گہرا علم اور صحیح دینی بصیرت رکھتے ہوں۔
(ب) اسلامی نقطہ نظر سے اہم مسائل پر گہری نظر ہو اور جو غیر اسلامی افکار و نظریات سے بخوبی واقف ہوں۔
(ج) جو اسلامی اخلاق و کردار کے حامل ہوں (د) جن میں احیائے دین و اعلائے کلمۃ اللہ کا صحیح جذبہ ہو
(ہ) جو گروہی، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر وحدت قلب و نظر کے ساتھ معاشرے کی اصلاح و تعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں۔
۲: ایسا نصاب تعلیم زیر عمل لانا جس میں دینی اور دنیوی تعلیم کا بہترین امتزاج ہو۔
(دستور جامعۃ الفلاح صفحہ ۳)

خدا کا فضل ہے کہ یہ ادارہ آج تک کامیابی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے مزید کامیابی عطا فرمائے آمین۔ لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچیوں کی تعلیم کے لئے بھی ایک مستقل شعبے کا نظم کیا گیا اور اس کا نام "کلیۃ البنات" رکھا گیا۔ اس کلیہ میں بھی تقریباً لڑکوں ہی جیسا نصاب ہے۔ بحمد اللہ کلیۃ البنات کی

اس قلیل مدت میں کافی ترقی کی اور اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کے فارغین کی ایک انجمن ہے جو جامعہ کے مقدس بار آور مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے قائم کی گئی ہے۔ اس کے پیش نظر یہ ہے کہ دیگر مدارس کی طرح ہم بھی یہاں سے نکلنے کے بعد کہیں گم نہ ہو جائیں بلکہ اپنے مقصد کو ہر وقت اپنے سامنے رکھیں اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہر وقت کوشاں رہیں۔ اس مقصد کے لئے یہ انجمن اپنا ایک ترجمان ماہنامہ مجلہ "حیات نو" پابندی سے نکال رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ انجمن ہر دو سال پر اپنے بھائیوں سے براہ راست تعلق برقرار رکھنے، ان کے اندر روح جہاد پھونکنے اور جمود و تعطل کو ختم کرنے کیلئے ایک اجلاس منعقد کرتی ہے تاکہ ماضی کے کاموں کا احتساب کرنے کے بعد مستقبل کے لئے نیا لائحۂ عمل متعین کیا جا سکے۔

گذشتہ اجلاسوں کی طرح اس سال بھی انجمن طلبۂ قدیم نے اپنے دو سالہ اجلاس کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے جو انشاء اللہ ۱۲، ۱۳، ۱۴ فروری ۱۹۸۸ء کو مادر علمی جامعۃ الفلاح میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس بار انجمن نے دیگر پروگراموں کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص پروگرام سیمینار بھی رکھا ہے جس میں ارباب مدارس اور اہم دینی شخصیات کو دعوت دی گئی ہے جو مختلف موضوعات پر مقالات پیش فرمائیں گی۔ اللہ تعالیٰ اس اجلاس کو کامیاب بنائے۔ آمین۔

دھیرے دھیرے وقت قریب ہوتا جا رہا ہے طلبۂ قدیم کی خوشیاں دوبالا ہوتی جا رہی ہیں ان کی آنکھیں مادر علمی کی جدائی کے لمحات دور ان پورے کرنے میں ہیں، دل میں جذبے کا سیلاب امڈ رہا ہے، آرزوؤں اور تمناؤں کی کلیاں کھلنے لگی ہیں۔ ایک طویل عرصہ بعد مادر علمی سے ملاقات کا شرف حاصل ہونے والا ہے، فروری کی ۱۲ ویں تاریخ کا شدت سے انتظار ہے۔

ادھر مادر علمی بھی سراپا انتظار بنی ہے، اس کے گلشن کو اپنے نونہالوں کیلئے صاف ستھرا کیا جا رہا ہے اور مسلسل تیاریوں میں مصروف ہے۔ مادر علمی نے ۱۲ ویں تاریخ کے انتظار میں آنکھیں اپنے دونوں پر بچھا دی ہیں تاکہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو پروانے دعا دے کر دلی سکون حاصل کرے۔ اور اب تو وہ اپنے جگر کے درشن سے عام ہو رہی ہے جیسے کہیں کوئی اس کا لال آ تو نہیں رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ اس محبت کو تا قیامت برقرار رکھے۔ آمین ثم آمین۔

مرتب: عبدالرب ارشی، متعلم جامعۃ الفلاح

مطالعۂ قرآن

> جناب مولانا ارشاد اللہ صاحب نے ۱۰، ۱۲ دسمبر ۱۹۸۷ء کو جامعۃ الفلاح کی مسجد میں بعد نماز فجر درس قرآن دیا تھا۔ یہ مطالعۂ قرآن آپ کے انہی دروس قرآن سے مستفاد ہے۔ مرتب نے مولانا کی باتوں کو صحیح طور پر نقل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اگر اس مضمون میں کوئی ایسی بات مولانا کی طرف غلط منسوب ہو گئی ہو تو اسے مرتب کی کوتاہی پر محمول کریں۔ (ادارہ)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۝ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝

"حمد اللہ کیلئے ہے جو عالمین کا پروردگار ہے۔ جو بے پایاں رحیم رحم کرنے والا ہے۔ یوم جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ صراط مستقیم پر ہماری رہنمائی فرما۔ ان لوگوں کی صراط پر جن پر تو نے انعام فرمایا۔ ان کی صراط پر نہیں جو مغضوب ہوئے اور گمراہ ہوئے۔"

سورۂ فاتحہ ایک ایسی سورہ ہے جو ہر مسلمان کو یاد ہوتی ہے اور قرآن کا ہر طالب علم اس کے مفہوم کو بھی کسی نہ کسی قدر ضرور سمجھتا ہے پھر بھی اس کی اہمیت کے پیش نظر چند باتیں گوش گزار کروں گا۔ اس میں سب سے پہلا لفظ حمد آیا ہے جس کا ترجمہ عام طور سے اردو زبان میں درج ذیل الفاظ اور شکل میں کیا جاتا ہے۔

۱۔ شکر ۲۔ تعریف ۳۔ تعریف و شکر

لیکن بہتر یہ ہے کہ اس کے ترجمے میں بھی اسی لفظ (حمد) ہی کو استعمال کیا جائے کیونکہ اس لفظ کے

اور حقیقت کے اعتبار سے معنی کے یہ دونوں پہلو بھی پائے جاتے ہیں، اور بعض اعتبار سے اختلاف بھی ہے۔

لفظ تعریف اردو زبان میں جس کی تعریف کے لئے آتا ہے کوئی ضروری نہیں کہ وہ جاندار ہو بلکہ وہ چیز غیر جاندار بھی ہو سکتی ہے مثلاً مسجد کی تعریف غیر جاندار کی تعریف ہے اور انسان کی تعریف جاندار کی تعریف ہے۔ اس کے برخلاف حمد صرف جاندار چیز کی تعریف کے لئے آتا ہے۔

اسی طرح جس کی تعریف کی جا رہی ہو کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ اس کا اپنا کسب ہو یا دوسرے کا عطا کردہ (وہبی) ہو یا مطلق ذات کی تعریف کی جا رہی ہو۔ جیسے مسجد کی تعریف کی جائے تو یہ اس کا اپنا کسب نہیں ہے بلکہ معمار کی کاریگری ہے اسی طرح کسی آدمی کی تعریف کی جائے تو یہ صورت کسبی ہے ہی نہیں بلکہ یہ وہبی چیز ہے پھر بھی اس پر تعریف کی جاتی ہے۔

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی تعریف ان دونوں پہلوؤں سے ہٹ کر ذاتی تعریف ہے، وہ علت العلل ثابت کی تعریف نہیں ہے کہ وہ علت پائی جائے تو تعریف ہوگی ورنہ نہیں ہوگی، بلکہ اللہ کی ذات قابل تعریف ہے اور ہم اس کے ذاتی فعل پر اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اگر فعل نہ پایا جائے تو تعریف کا کوئی سوال ہی نہیں جیسا کہ اس آیت سے واضح ہے:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوا وَّيُحِبُّونَ أَن يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُم بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۔ آل عمران ۱۸۸

مطلب یہ ہے کہ حمد کسی فعل پر کی جاتی ہے اور وہ فاعل کی حمد ہو جاتی ہے اور جب کسی فعل کی تعریف کریں تو فاعل کی تعریف خود بخود ہو جاتی ہے جیسے مسجد کی تعریف سے بنانے والے کی تعریف خود بخود ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کائنات کی تعریف سے خالقِ کائنات کی تعریف خود بخود ہو جاتی ہے۔

الحمد للہ کا یہ ترجمہ عام طور سے ان دو طریقوں سے کیا جاتا ہے:

۱۔ ساری تعریف اللہ کے لئے ہے۔

۲۔ حمد اور شکر اللہ ہی کی ذات ہے۔

لیکن ان ترجموں سے گویا ایسی شکل پیدا ہوتی ہے کہ یا تو کسی سوال کا جواب ہے یا کسی منکر کے انکار کا رد ہے جیسا کہ کسی سائل کے جواب پر یا کسی منکر کے انکار کے جواب پر اِنَّ اور لام داخل کرتے ہیں اور اس سے تاکید کا مفہوم لے کر اس قسم کا ترجمہ کرتے ہیں حالانکہ یہاں یہ صورت نہیں ہے

بلکہ یہ انشائیہ جملہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

الحمد للہ الذی وهب لی علی الکبر اسمٰعیل واسحٰق ان ربی
لسمیع الدعاء (۳۹ - ابراہیم)

یعنی یہ کہ ایک مومن کی طرف سے جذبۂ ممنونیت کا اظہار ہے نہ کہ کسی سوال کا جواب یا انکار کا جواب یا کوئی دعویٰ البتہ غیر مومن جب مخاطب ہو تو اس وقت اس کی حیثیت دعویٰ کی ہو جائے گی۔

ربّ: پالنے والا، پروردگار۔ اس کے صحیح معنی کو سمجھنے کے لئے ربّ اور ربوبیت کے معنی پر غور کرنا چاہئے کیونکہ یہ مشتق نہیں ہے بلکہ اصل لفظ ہے اور ربوبیت وغیرہ اس سے بنے ہیں لہٰذا اصطلاح کو معنی جانیں تو صحیح معنی ہم جان سکتے ہیں اور ربوبیت وغیرہ کا صحیح مفہوم متعین کر سکتے ہیں۔ جیسے لفظ اخ ہے اور اسی سے تآخی اور مؤاخاۃ وغیرہ بنا ہے۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ ہم "تآخی" اور مؤاخاۃ کے ذریعے "اخ" کا صحیح معنی سمجھنے کی کوشش کریں، ہمیں پہلے "اخ" کا معنی سمجھنا چاہئے۔ تبھی ہم مؤاخاۃ وغیرہ کا صحیح معنی سمجھ سکتے ہیں۔

ربّ کے اصل معنی ہیں وہ بالاتر ہستی جو مخلوقات کی تربیت کرنے والی ہو اور وہ مخلوقات اس کے ماتحت و قبضۂ قدرت میں ہوں اور اس کے احسانات سے فائدہ اٹھا رہے ہوں۔

یہاں ایک بات یہ بھی دھیان میں رہے کہ آیت کو پڑھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس پر وقف کیا جائے اگر ایسا نہ کریں تو معنی و بلاغت میں کمی آ جاتی ہے یا وہ متاثر ہوتا ہے۔ عام طور سے ہم سوال و جواب دعا و قبولیت وغیرہ سب کو ایک ساتھ پڑھ دیتے ہیں جس سے معنی و بلاغت میں کمی آ جاتی ہے اور وہ متاثر بھی ہوتا ہے جیسے عام طور سے لوگ ایک ہی سانس میں پڑھتے ہیں:

والسماء والطارق ۝ وما ادراک ما الطارق ۝ النجم الثاقب ۔۔۔۔۔۔

اس میں وما ادراک ما الطارق سوال ہے اور النجم الثاقب جواب ہے۔ اگر اس کو ایک ساتھ پڑھیں تو معنی وغیرہ میں فرق آ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ سوال یعنی وما ادراک ما الطارق الگ پڑھیں اور جواب النجم الثاقب وقف کرنے کے بعد پڑھیں تاکہ محسوس ہو کہ دونوں دو چیزیں ہیں اور دونوں کا الگ موقع ہے۔

اس کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ ہم ایمان کے منافی کتنی خلاف ورزی کرتے ہیں کیونکہ بغیر وقف کے پڑھنا

غیر مسنون طریقہ ہے۔ آپؐ کی سنت یہ تھی کہ آپؐ ہر آیت الگ الگ پڑھتے تھے جیسا کہ ترمذی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے: عن ابن جریج عن ابن ابی ملیکۃ عن ام سلمۃ قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقطع قراءتہ یقول الحمد للہ رب العالمین، ثم یقف ثم یقول الرحمن الرحیم، ثم یقف۔

اسی سورۂ فاتحہ کے سلسلے میں حدیث قدسی ہے۔ اس سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ بندہ ایک آیت پڑھتا ہے اور ٹھہرتا ہے تو اللہ اس پر جواب دیتا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مسلم کی روایت ہے کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تعالیٰ قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی نصفین فنصفها لی ونصفها لعبدی ولعبدی ما سأل۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول العبد: الحمد للہ رب العالمین، یقول اللہ: حمدنی عبدی، یقول العبد: الرحمن الرحیم، یقول اللہ: اثنی علیّ عبدی، یقول العبد: ملک یوم الدین، یقول اللہ: مجدنی عبدی، یقول العبد: ایاک نعبد وایاک نستعین، یقول اللہ: هذه الآیۃ بینی وبین عبدی ولعبدی ما سأل، یقول العبد: اهدنا الصراط المستقیم ...... الی ...... الضالین، یقول اللہ: فهؤلاء لعبدی ولعبدی ما سأل۔

اسی طرح اس کے فوائد بھی ہیں مثلاً ایسا کرنے سے وہ زیادہ لذت اور خشوع پائے گا جیسا کہ اس حدیث قدسی سے بھی واضح ہے کہ کس طرح وہ وقف کر کر کے اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے اور اللہ اسے اپنے لطف و کلام سے نوازتا ہے۔

رب العالمین ایک فعلی وصف ہے۔ ہم ہر طرف اس کائنات میں اس کا مشاہدہ دیکھتے ہیں۔ ایک منکر بھی نظام ربوبیت کا انکار نہیں کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ کائنات میں صحیح ڈھنگ سے غور کرے۔ اس فعل اور اس کے مظاہر سے ذات کے بارے میں جو تصور ہوتا ہے وہ الرحمن الرحیم ہے۔ قرآن سے یہ بھی واضح ہے کہ رحمت و ربوبیت لازم و ملزوم ہے جیسا کہ قرآن خود شاہد ہے۔ والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کی تلقین کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيرا۔ (اسراء ـ ٢٤)

یہاں صفت ربوبیت کا ذکر کر کے رحم کی دعا مانگی جا رہی ہے۔ عام طور سے مفسرین اس کی تاویل میں یہ کہتے ہیں کہ یہاں حذف کا اسلوب ہے یعنی اصل عبارت یوں ہے: رب ارحمهما كما رحماني وربياني صغيرا۔ یعنی "رحمانی" محذوف ہے۔

لیکن یہ در اصل قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ ایک کو ذکر کر کے دونوں کا فائدہ حاصل کرتا ہے یعنی تعلق معنی اور قربت کی بنا پر دونوں کو ایک مقام پر لا کر رکھ دیا گیا ہے جس سے صاف واضح ہے کہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک ہی صفت رحمت کے دو صیغے کیوں لائے گئے ہیں۔ دو صفت لانے کا کیا فائدہ ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ تاکید کے لئے لائے ہیں جیسا کہ اردو میں بھی تاکید کے لئے مترادف لاتے ہیں جیسے گورا چٹا، کالا کلوٹا۔ لیکن یہ تعلق تاکید کے لئے نہیں ہوتا ہے بلکہ اس سے معنی میں وسعت پیدا ہوتی ہے مثلاً کالا کلوٹا سے جو مفہوم ادا ہوتا ہے کبھی الگ الگ کسی ایک سے وہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح "الرحمن الرحیم" سے جو مفہوم ادا ہوتا ہے وہ مفہوم الرحمن الرحیم کو الگ الگ لا کر ادا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے دونوں کا لانا ضروری ہے۔ "الرحمن" مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کے اندر کثرت و جوش کا مفہوم پیدا ہوتا ہے جس کا فیض ہر ایک کو پہنچ رہا ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ ورحمتی وسعت کل شیئ۔ (اعراف ـ ١٥٦)

الرحیم باب سے اس کے اندر دوامیت کا بھی مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ رحمت و ربوبیت لازم و ملزوم ہیں اس لئے جس طرح وہ تمام کا رب ہے اسی طرح وہ تمام پر رحیم بھی ہے۔ نیز یہ صفات اس کی ذاتی ہیں کسی سے مستعار لی ہوئی نہیں ہیں۔ پھر یہ صفت رحیم مستقل و پائدار صفت ہے۔ گویا عالمین میں جو وسعت ہے وہ الرحمن میں پائی جا رہی ہے۔ اور رب میں جو استمرار و دوام ہے وہ رحیم میں پائی جا رہی ہے۔ اسی طرح سے حاصل ہونے والے علم کے بارے میں کہتے ہیں کہ حاضر سے غائب کا علم حاصل ہوتا ہے یا حاصل کیا جاتا ہے۔

ربوبیت کا دوسرا لازمی تقاضا ملکیت ہے اور وہ یہ کہ جو رب ہے آخر وہ مالک بھی ہوگا۔ ذلکم اللہ ربکم له الملك۔ (فاطر: ١٣) میں بالکل یہی بات کہی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ جو رب ہوگا وہ مالک ضرور ہوگا۔ اور جو اس کا مالک ہوگا وہ کسی اور کا نہ ہوگا۔ اس طرح حاضر سے غائب کو جوڑ دیا گیا ہے۔ یعنی انسان غیب کا علم نہیں رکھتا اور نہ ہی بجائے خود کچھ جان سکتا ہے۔ البتہ حاضر کو بنیاد بنا کر کے مستقبل کے

کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ جیسا کہ یہاں حاضر سے غائب کو گریز کیا گیا ہے۔

رب کا تیسرا راز حکمت ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس نے پیدا کس لئے کیا؟ پرورش کس لئے کر رہا ہے؟ کیا یوں ہی بے مقصد اور الل ٹپ اس نے پیدا کر دیا اور پرورش کر رہا ہے یا اس کے پیچھے کوئی مقصد اور حکمت ہے اس لئے کہ اگر حکمت نہ ہو تو ربوبیت بے معنی ہے۔ ایک عام عقل کا انسان بھی بے حکمت ربوبیت کو تسلیم نہیں کر سکتا ہے تو بھلا وہ بالاتر ہستی کیسے بے حکمت ربوبیت خلق میں لگی رہ سکتی ہے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ اس نے مقصد کے تحت ساری چیزوں کو پیدا کیا ہے اور جو اس حکمت و مقصد کو پورا کرے اور جو پورا نہ کرے ضروری ہے کہ ان دونوں کے درمیان اللہ تعالیٰ انصاف کرے۔ یہ اس کے رب ہونے کا بھی تقاضا ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: كتب على نفسه الرحمة ليجمعنكم الى يوم القيامة لا ريب فيه۔ (۱۲، انعام)

اس سے صاف واضح ہے کہ رحمت کے لازمی نتیجے کے طور پر آخرت کا ظہور ہوگا بلکہ رحمت کا حقیقی ظہور آخرت ہی کے دن ہوگا جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ دنیا میں تو رحمت کا صرف ایک حصہ ہے اور آخرت میں رحمت کا ۹۹ حصہ ہوگا۔ امام بخاریؒ نے باب الادب میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ:

اخبرنا سعيد بن المسيب ان ابا هريرة قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول جعل الله الرحمة فى مائة جزء فامسك عنده تسعة وتسعين جزءا وانزل فى الارض جزءا واحدا ..... الى آخر الحديث۔

اللہ کا یہ جامع تصور ہے جو ان آیات سے ہمیں ملتا ہے۔

اب آگے بتایا جا رہا ہے کہ انسان کی کیا حیثیت ہے، اس کا کیا مقام ہے اور اسے کیا اور کیسے کرنا چاہئے۔ کہا گیا ہے: ایاک نعبد۔

عبادت تین چیزوں کا مجموعہ ہے، محبت، خوف اور رجا۔ ان تینوں کے مجموعے سے جو کیفیت بنتی ہے اسی کو عبادت کہتے ہیں۔ ان تینوں میں اعتدال و توازن قائم رہے تبھی صحیح معنوں میں عبادت ہوتی ہے۔ اس میں کمی بیشی بھی نقصان دہ ہے اور ان کا الگ الگ ہونا بھی نقصان دہ ہے۔ مثلاً صرف محبت پائی جائے تو آدمی گستاخ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح صرف خوف پایا جائے تو آدمی کی قوت کارکردگی گھٹ جاتی ہے۔ اس کے دل میں لگن نہیں پیدا ہوتی۔ اسی طرح صرف رجا پایا جائے تو اس سے آدمی بدعمل ہو جاتا ہے۔

محبت کا تعلق عام طور سے ماضی سے ہوتا ہے یعنی ماضی میں اللہ تعالیٰ نے جو احسانات کئے ہیں۔ انعام و اکرام سے نوازا ہے تو اس پر ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ نیز مستقبل میں بھی اگر کچھ ملنے کا امکان ہو تو اس کی بنیاد پر محبت کی جا سکتی ہے۔ یہ در اصل صفتِ رب کا تقاضا ہے کہ انسان کے دل میں محبت پیدا ہو۔

اسی طرح وہ مالک ہے۔ ساری چیزیں اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ جو کچھ مل سکتا ہے اسی سے مل سکتا ہے۔ لہٰذا رجا کی جا سکتی ہے تو اسی سے کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح مالک ہونے کی وجہ سے وہ قادر و مقتدر ہے۔ اگر ہم نے سرمو اس کے احکام سے انحراف کیا تو وہ ہماری گرفت کر سکتا ہے۔ اسی لئے خوف بھی کھایا جا سکتا ہے تو اسی سے کھایا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ ہم انسان ہیں، کمزور ہیں، ہر وقت غلطی کا امکان ہے اس وجہ سے ان تصورات میں خوف کا پہلو زیادہ غالب ہوتا ہے۔

ان تمام شعور و احساس کے پیدا ہو جانے کے بعد ہر ایک کے دل میں ایک جذبہ ابھرتا ہے اسی کو ایاک نستعین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے کہ انسان کو مستقبل میں بہت سی چیزوں کی احتیاج رہتی ہے اور اس احتیاج کی تکمیل اسی مالک کے پاس سے ہو سکتی ہے اس لئے خوف و رجا دونوں جذبات سے معمور ہو کے اس سے اعانت طلب کرتا ہے جو در اصل خوف و رجا کا مظہر ہوتا ہے۔

پھر آگے طلب ہدایت ہے۔ اس طرح پوری سورہ کے اندر مختصراً تین چیزیں بیان ہوئی ہیں حمد، عہد اور طلب ہدایت۔ اگر ہم اس کی آیات کو الگ الگ پڑھیں تو یہ چیزیں صاف واضح ہو جائیں گی۔ الحمد سے یوم الدین تک حمد اور اس کے متعلقات کا بیان ہے اور ایاک ..... نستعین تک عہد کا بیان ہے اور آگے طلب ہدایت ہے۔ اسی کو اگر ایک ساتھ پڑھیں یا دو کو ایک ساتھ ملا دیں مثلاً ایاک نعبد و ایاک نستعین اهدنا الصراط المستقيم ..... تو مطلب صاف واضح نہیں ہوگا لیکن نستعین پر وقف کریں تو مطلب زیادہ واضح ہو جائے گا۔

سورہ فاتحہ کے اندر ساری باتیں آگئی ہیں اس کو پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے سب کچھ عرض کر دیا اور سب کچھ مانگ لیا اس لئے نماز کے اندر فاتحہ کے علاوہ قرآن کے جو دوسرے حصے پڑھے جاتے ہیں

وہ ضمیر ہیں اور تاکید کے لئے ہیں، اس لئے بھی کو صرف فاتحہ کے جدی جھک جاتے ہیں اور یہ جھکنا درحقیقت عمل عبودیت کے اظہار کا ایک طریقہ ہے لہٰذا ایسی حالت میں ہمیں تسلیم الٰہی کرنی چاہئے۔ رکوع کے لحاظ سے یہ چیز مناسبت رکھتی ہے اسی لئے رکوع و سجود کی حالت میں قرآن پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، اسی حالت میں تسبیح کرنی چاہئے اور طلب دعا ہونی چاہئے۔ اسی لئے رکوع و سجود کی حالت میں دعا زیادہ مقبول ہوتی ہے اور اسی حالت میں عاجزی و انکساری بھی زیادہ پائی جاتی ہے۔ استعانت کے وقت جو تصور دل میں پیدا ہوتا ہے وہ ہر وقت پیدا نہیں ہو سکتا ہے اسی لئے رکوع و سجود کا مطالبہ کرنے کے بعد عبادت کا مطالبہ کیا گیا ہے[1] اسی مناسبت سے دونوں کو یکساں قرار دیا گیا ہے اور دعا کو عبادت کا مغز کہا گیا ہے،

الدعاء مخ العبادۃ۔

اور قرآن میں تو دعا کے مقام پر عبادت کو استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ درج ذیل آیت میں ہے:

وقال ربکم ادعونی استجب لکم ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جہنم داخرین۔

اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو ہر چیز از خود بغیر مانگے دینے کا وعدہ کیا ہے اور دے رہا ہے خواہ کوئی اس کا نام لے یا نہ لے، مانگے یا نہ مانگے مگر صرف ایک چیز ایسی ہے جو اس نے نہیں دی ہے اور وہ ہدایت ہے یہ ہدایت ایک چیز ہے جو صرف مانگنے پر ملتی ہے وہ صرف مانگنے پر ہی نہیں بلکہ گڑگڑا کر مانگنے پر ملتی ہے۔ یعنی جب تک اس کے لئے طلب صادق نہ پائی جائے وہ چیز نہیں مل سکتی ہے۔

ہمارے قبل تین آیات تو اللہ کے وصف میں تھیں اور اھدنا سے آخر تک آیات بندے کے لئے ہیں

لفظ ہدایت صلات اور مفعول کے اعتبار سے مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ جب ہدایت "الی" کے صلہ کے ساتھ ہو تو مطلب ہوگا دور سے راستہ دکھانا[2] اور جب ہدایت "ل" کے صلہ کے ساتھ ہو تو مطلب ہوگا راستہ دکھا کر کسی منزل تک پہنچانا لیکن یہ ہدایت عارضی ہوتی ہے۔ اس میں مستقل رہنمائی کا معنی نہیں پایا جاتا ہے ان دونوں صورتوں میں ہدایت عارضی اور عارضی ہوتی ہے اور جب ہدایت مفعول کے ساتھ آتی ہے تو مطلب ہوتا ہے ہمہ وقت رہنمائی کرتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچانا۔ اور انسان اللہ کی عبادت کے لئے ہمہ وقت

---

[1] ارشاد الٰہی ہے: یا ایھا الذین آمنوا ارکعوا واسجدوا واعبدوا ربکم وافعلوا الخیر لعلکم تفلحون۔ (الحج:۷۷)

[2] [illegible] ساتھ [illegible] سفر طے کرے۔

قسم کی ہدایت کا محتاج ہے اسی لئے یہاں مفعول دیا گیا ہے یعنی اے انسان ہم آن تیری ہدایت کا محتاج ہے صرف جاننے کے لئے نہیں بلکہ عمل کرنے کے لئے بھی محتاج ہے اور یہ ہدایت پوری کی پوری صرف اللہ کے رحم و کرم پر منحصر ہے یعنی ہم طلب کریں اور وہ دے تبھی مل سکتی ہے۔ یہی احتیاج، طلب ہدایت اور ہدایت کا اللہ کے رحم و کرم پر منحصر ہونا یہ چیز وہ احساس و شعور ہیں جن کو پیدا کرنے کے لئے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا لازمی ہے لیکن صرف پڑھنا کافی نہیں بلکہ سمجھ کر پڑھیں تبھی یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ ہمارے اندر ہدایت کی طلب کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے اور تبھی سورۂ فاتحہ کی کیفیت سے ایک مومن لطف اندوز ہو سکتا ہے[1]۔

جس طرح رب کے اندر آگے کی تمام صفات پائی جاتی ہیں اسی طرح ہدایت کے اندر سب کچھ ہے لیکن پھر بھی آگے چند صفات کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ صورت واقعہ کے بیان کے لئے کیا گیا ہے تاکہ یہ کیفیات برابر مستحضر رہیں یعنی یاد دہانی بھی ہیں اور ہوشیار رکھنے کا ذریعہ بھی ہیں۔

بات فعل سے شروع ہوئی تھی لیکن آگے صفت کا صیغہ آ گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا ہے جواب یہ ہے کہ صفت کا صیغہ اس لئے لائے ہیں کہ ایسا عملاً ہو چکا ہے لہٰذا ہوشیار ہو جاؤ یعنی یہ کہ ماضی میں اس طرح کی بات تمہارے تجربے میں آ چکی ہے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس سے انسان کا ذہن تیار ہوتا ہے اور پھر واقعتہً دل سے آواز نکلتی ہے اھدنا......

اسی طرح منعم علیہم کے مقابلے کے طور پر مغضوب علیہم استعمال کیا گیا ہے حالانکہ منعم علیہم کا مقابل معذب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغضوب علیہم کے ذریعے تیسری کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے یعنی یہ کہ معذوبین کو عذاب دیا جائے گا اور اس کا نتیجہ غضب ہے جس کے بھی وہ شکار ہوں گے، اور یہ صفت کا صیغہ اس بات پر دال ہے کہ تم پر بھی یہ غضب نازل ہو چکا ہے، اور آئندہ بھی اگر ایسا کیا گیا تو پھر غضب نازل ہو سکتا ہے۔ مغضوب علیہم کے سلسلے میں تفسیری قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہودی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو غضب کے شکار ہو چکے اب آئندہ کوئی شکار نہیں ہوگا، بلکہ یہ بات مثالاً کہی گئی ہے کہ یہود نے ایسا کیا اور غضب کے شکار ہوئے اور آئندہ اگر کوئی ایسا کرے گا خواہ وہ امت مسلمہ سے تعلق رکھتا ہو تو وہ بھی اس غضب کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے

---

[1] یہاں صراط مستقیم کہا ہے اس کی بھی وضاحت خود قرآن نے کر دی ہے، آیا ہے ان اعبدونی ھذا صراط مستقیم (یٰس) یعنی میری عبادت کرو یہی صراط مستقیم ہے۔ مطلب یہ کہ عبادت ایسے کی جائے جو اس کا حق ہو اور وہی کی جائے۔

بیہودگی جو ناشروع نہیں ہے۔

ضالین: خود بھی گمراہ ہوں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والے ہوں۔ عام سورۃ سے اس کے مد کو فقی کھینچا جاتا ہے۔ زیادہ کھینچنا صحیح نہیں بلکہ صرف ضرورت بھر کھینچنا چاہئے۔ اور اس انداز سے پڑھنا چاہئے کہ احساس طلب حق تر و تازہ ہو بلکہ ایسا محسوس ہو کہ ہم کچھ طلب کر رہے ہیں۔

اس سورۃ کے تعلق سے یہ چند باتیں تھیں جنھیں میں نے آپ کی خواہش کے احترام میں پیش کیا ہے تاکہ آپ کو شاید کچھ علمی و عملی فائدہ پہنچ سکے۔

غزل

مجاہد کلیم پردی

چھوڑ کر شیش محل کی باتیں
کیجیے جہد و عمل کی باتیں

آج کی بات کرو، اے یارو
کل کی باتیں تو ہیں کل کی باتیں

اس کے پھول، کھلیں گے کیونکر
ہوں گی جب جنگ و جدل کی باتیں

جو حقیقت ہو، وہ کہہ دیتے ہیں
ہم سے آتی نہیں چھل کی باتیں

دوستی، پیار و وفا، ہمدردی
یہ تو ہیں شعر و غزل کی باتیں

کچھ عمل بھی ہے مجاہد صاحب؟
یا فقط، حسن عمل کی باتیں

●●

ایک اہم انٹرویو

جناب پروفیسر محمد سلیم صاحب سے چند سوالات

سوال: کیا خدا موجود ہے؟

جواب: ہم جن چیزوں کا موجود مانتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کو ہم حواس کی مدد سے دریافت کرتے ہیں جیسے میز، شور و غل، خوشبو، ریشم۔ دوسری وہ جن کو ہم اپنی عقل کی مدد سے جانتے ہیں جیسے دور سے بلب روشن دیکھ کر جان لیا کہ بجلی ہے، انسان کو بات کرتے دیکھا تو جان لیا کہ زندگی ہے، حالانکہ ہم نے نہ روح دیکھی نہ بجلی دیکھی، ورنہ روح دیکھی۔ خداوند تعالیٰ ہر وجہ سے بالاتر، غیر مرئی (INVISIBLE) ہے، اس کو صرف عقل کی مدد سے ہم جان سکتے ہیں۔

لیکن حواس سے دریافت شدہ اشیاء کو بھی عقل کی مدد سے زیادہ بہتر طریقہ سے جان سکتے ہیں۔ عقل حواس کی غلطیوں کی اصلاح کر دیتی ہے، آنکھ بتاتی ہے کہ سورج ایک طشتری کے برابر ہے، عقل کہتی ہے کہ سورج زمین سے لاکھوں گنا بڑا ہے۔ اسٹیشن پر کھڑے ہو کر انسان کہتا ہے کہ ریل کی پٹریاں آگے جا کر مل جائیں گی، عقل بتاتی ہے یہ متوازی ہیں یہ نہیں ملیں گی۔

سوال: وہ آثار اور نشانیاں کیا ہیں؟

جواب: اگر کہیں موزونیت، مقصدیت، حکمت اور دانائی کی کوئی بات نظر آتی ہے تو ہم جان لیتے ہیں کہ یہ کسی صاحب عقل ہستی کا کام ہے، اس کے پس پردہ کسی حکیم اور مدبر صانع کی کارفرمائی ہے۔ پتھر اگر راستہ میں پڑا ہوا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یوں ہی لڑھک کر یہاں آ گیا ہے لیکن اگر پتھر دیوار میں موزوں انداز میں چنا ہوا ہو تو ہم کہتے ہیں کہ یہاں اس کو کسی انسان نے موزوں کیا ہے، اس کی موزونیت انسانی ذہن کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہاں ہم یہ بات ہرگز ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ یہ پتھر خود بخود یہاں دیوار میں آ کر موزوں ہو گیا ہے۔

بالکل اسی طرح اگر مظاہر کائنات میں مقصدیت اور موزونیت، حکمت، دانائی کے مظاہر بکھرے نظر آتے ہیں تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ ان مظاہرات کے پس پردہ دانا اور حکیم ہستی

کارفرما ہے۔ یہ ساری تخلیق ایک مدبّر اور حکیم صناع کی ہے۔

سوال: وہ حکمت و دانائی کے آثار کہاں ہیں؟

جواب: اربوں کھربوں سال سے سورج مقررہ وقت پر پابندیٔ وقت کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے۔ موسم اپنے اوقات پر آتے ہیں، بارشیں اپنے وقت پر ہوتی ہیں۔ کیا یہ نظم کی پابندی جو لاکھوں اربوں سال سے چلی آرہی ہے کسی حکیم اور مدبّر صانع کی طرف اشارہ نہیں کر رہی ہے؟ کیا یہ خود بخود ہو سکتا ہے؟ کیا اندھی بہری فطرت یہ کام کر سکتی ہے؟

جغرافیہ دان بتاتے ہیں کہ کرۂ ارض کا قیام عمودی نہیں ہے بلکہ یہ قدرے جھکا ہوا ہے۔ عمودی ہونے کی صورت میں زمین پر سردی گرمی ہمیشہ یکساں رہتی، ورنہ ناقابلِ برداشت ہو جاتی پھر یہاں کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر اب اس جھکاؤ کی وجہ سے سردی، گرمی میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں اس لئے یہ قابلِ برداشت ہے۔ گویا صانع حکیم کی تخلیق کے روزِ اول ہی میں یہ بات پیشِ نظر تھی کہ کرۂ ارض کا یہ موسم حیاتِ انسانی کو فروغ دینے کا سبب بنے۔ کیا یہ بات مدبّر اور حکیم صانع کی طرف اشارہ نہیں کر رہی ہے؟ کیا یہ سب کچھ خود بخود ہو گیا ہے۔ کیا یہ کام اندھی بہری فطرت کر سکتی ہے؟

انسان کا بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ایک گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے۔ نہ عقل، نہ سمجھ، نہ زبان۔ محبت بھری ماں اس کو اپنے سینے سے چمٹاتی ہے۔ خاص اسی مقام پر اس کی غذا کے لئے دودھ کے دو چشمے جاری موجود ہوتے ہیں۔ کسی دوسرے مقام پر پیٹھ پر، ران پر یا کمر پر نہیں ہیں۔ اس لئے کہ بچہ سینے پر منہ مارتا ہے، نہ کمر پر، نہ ران پر۔ کیا یہ مقصدیت حکیم اور مدبّر صانع کی طرف اشارہ نہیں کر رہی ہے؟ کیا یہ کام خود بخود ہو گیا؟ کیا یہ کام اندھی بہری فطرت کر سکتی ہے؟

انسان کی آنکھ دیکھئے۔ آنکھ بہت نازک ہوتی ہے۔ اس کی حفاظت مقصود ہے۔ آنکھ کے دروازے پر پہرے داروں کا دستہ پلکوں کی صورت میں مستقل کھڑا رہتا ہے۔ پھر بھی کسی طرح گرد و غبار آنکھوں کے اندر داخل ہو جائے تو آنسوؤں کا سیلاب آنکھ کو دھو کر صاف کر دیتا ہے۔ صفائی کا یہ خودکار نظام (SELF - FLUSHING) کیا مقصدیت کی

غمازی نہیں کر رہا ہے؟ کیا یہ کسی حکیم اور مدبّر صانع کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہے؟ کیا خود بخود ہو گیا؟ کیا یہ کام اندھی بہری فطرت کر سکتی ہے؟

انسان کا کان دیکھئے، اس کی بناوٹ پر غور کیجئے۔ کان کا مصرف آوازوں کو سننا ہے۔ آواز کی لہروں کو وصول کرنا ہے۔ لہریں خاص انداز میں دائرے میں سفر کرتی ہیں۔ کان کی ساخت اسی مقصد کو سامنے رکھ کر بنائی گئی ہے۔ کیا یہ سب اعلیٰ مقصدیت اور اعلیٰ حکمت کسی حکیم اور مدبّر کی طرف اشارہ نہیں کر رہی ہیں؟ کیا یہ کام اندھی بہری فطرت کر سکتی ہے؟

ہر چیز جم کر بھاری ہو جاتی ہے اور بھاری چیز پانی میں نیچے جا کر بیٹھ جاتی ہے مگر پانی جم کر برف بن کر ہلکا ہو جاتا ہے۔ بجائے نیچے بیٹھنے کے سطحِ آب پر تیرتا ہے۔ اگر وہ نیچے بیٹھ جاتا تو سردی کے زمانے میں تمام دریا اور سمندر جم جاتے اور سمندروں میں موجود آبی مخلوقات جم جاتیں اور مر جاتیں۔ بحالاتِ موجودہ برف جم کر سطحِ آب پر آجاتی ہے۔ سرد ہواؤں کو نیچے نفوذ کرنے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اسی وجہ سے سردی کے موسم میں دریاؤں، سمندروں کا پانی بہتا رہتا ہے۔ مچھلیاں اور دیگر آبی مخلوقات زندہ رہتی ہیں۔ یہ مقصدیت یہ حکمت کیا کسی حکیم اور مدبّر صانع و خالق کی طرف اشارہ نہیں کر رہی ہے؟ کیا یہ خود بخود ہو گیا ہے؟ کیا یہ کام اندھی بہری فطرت کر سکتی ہے؟

قطب شمالی کے علاقے میں ہمیشہ برف پڑی رہتی ہے۔ وہاں کوئی سبزہ اور روئیدگی نہیں ہے۔ وہاں بھی انسان آباد ہیں جن کو اسکیمو کہتے ہیں۔ سردیوں میں جب سارا خطہ برفستان بن جاتا ہے تب بھی ان کی خوراک کا انتظام موجود ہے۔ ان لوگوں کو اپنے تجربے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فلاں فلاں مقام پر دریا بہتا ہے اگرچہ اب وہ برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ وہاں وہ بارہ سنگے کی پسلی کی ہڈیوں سے بنے ہوئے نیزے سے برف میں سوراخ کرتے ہیں۔ روشنی اندر نفوذ کرتی ہے۔ مچھلیاں روشنی کی طرف لپکتی ہیں۔ وہ آسانی سے ان مچھلیوں کا شکار کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح ان کو غذا ملتی رہتی ہے۔ کیا ماحول میں اور انسانی ضروریات میں تطابق اور مقصدیت کسی حکیم اور مدبّر خالق کی طرف اشارہ نہیں کر رہی ہے؟ کیا یہ سب کچھ خود بخود ہو گیا ہے؟ کیا اندھی بہری فطرت یہ کام کر سکتی ہے؟

غرضیکہ جو شخص بھی ہٹ دھرمی کی عینک آنکھوں سے اتار کر کھلے دل سے اور کھلی آنکھ سے مناظرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت پر نظر ڈالے گا اور غور کرے گا تو اس کو یقیناً ان مناظر اور مظاہر کے پس پردہ ہر جگہ حکیم و دانا خالق و صانع خداوند تعالیٰ کا دستِ قدرت نظر آئے گا۔ وہ خداوند تعالیٰ کی ذات و وجود، کل کائنات میں اس کی کارفرمائی پر ایمان لے آئے گا۔ وہ یقین کرے گا کہ یہ کائنات ایک بلند مقصد اور اعلیٰ حکمت سے تخلیق کی گئی ہے۔ ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

سوال: آپ لوگ بزرگوں کو کیوں نہیں مانتے؟

جواب: انسان بھی عجیب مخلوق ہے۔ اگر اکڑے تو خدا کا بھی انکار کر دے۔ اور جب جھکے تو اس کے بندوں کو بھی خدائی تقسیم کرتا پھرے۔

بے شک صاحب، ہم بزرگوں کو مانتے ہیں۔ وہ اللہ کے نیک بندے تھے۔ وہ باعمل اور نیک کردار تھے۔ انھوں نے لوگوں کو راہِ حق دکھائی۔ انھوں نے اسلام کی اشاعت کی۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہوگا اور ان کے درجات بلند کرے گا۔

اب میں یہاں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ اگر کوئی طالب علم بڑا محنتی ہو، ذہین ہو، با اخلاق ہو، تمام اساتذہ اس سے خوش ہوں، امتحانات میں بھی وہ اوّل آئے۔ کالج کی انتظامیہ اس سے خوش ہو کر سونے کا تمغہ دے۔ اس کا نام یادگاری تختی پر لکھا جائے۔ کیا ان تمام باتوں کے باوجود اس طالب علم کو یہ اختیار مل جائے گا کہ وہ جس کو چاہے پاس کر دے اور جس کو چاہے فیل کرا دے؟

سوال: یہ اختیار تو کالج انتظامیہ کے پاس رہے گا۔ وہ کسی کو نہیں دے سکتی۔

جواب: بس معاملہ صاف ہو گیا۔ بزرگ کتنے ہی نیک ہوں، کتنے ہی مقربِ خدا ہوں، مگر وہ ہرگز خدائی میں شریک نہیں ہوتے۔ مثلاً جلانا، مارنا، اولاد دینا، رزق دینا، کامیابی دلانا، مغفرت کرانا، یہ تمام کام خداوند تعالیٰ سے متعلق ہیں۔ کوئی دوسرا فرد خواہ رسول ہو یا بزرگ، ان کے

اختیارات میں خداوند تعالیٰ کا شریک نہیں ہوتا۔ بزرگ کی بزرگی کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اب وہ خدائی اختیارات کا مالک بن گیا۔

سوال: مگر لوگ کہتے ہیں کہ نیک ہستیاں جسے چاہیں جنت میں لے جا سکتی ہیں؟

جواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا نہ کوئی بزرگ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی ولی ہو سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہر شخص اپنے اعمال کی بنیاد پر جنت جائے گا۔ آپ نے اپنی بیٹی فاطمہؓ سے اور اپنی پھوپھی صفیہؓ سے فرمایا:

"آخرت میں میں تمہارے کام نہ آسکوں گا۔ وہاں تمہارے اعمال تمہیں بخشوائیں گے۔ اس گمان میں نہ رہنا کہ میں رسولؐ کی بیٹی ہوں، اور میں رسولؐ کی پھوپھی ہوں۔ لہٰذا نیک اعمال کرو۔"

آپ کے چچا ابوطالب نے آپ کی پرورش کی تھی۔ آپ پر بڑے مہربان تھے۔ مگر مرتے دم تک وہ رہے دینِ کفر پر۔ آپ نے آخری وقت ان سے کہا بھی کہ آپ کلمہ پڑھ لیں تاکہ میں آپ کی سفارش کرنے کے قابل ہو جاؤں۔ مگر وہ نہ مانے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چچا کو پرورش کرنے سے نجات نہیں دے سکی تو کسی دوسرے کو چھونے سے کیسے نجات مل سکتی ہے۔ یہ سب اسلام کے منافی باتیں ہیں۔ جب رسول اللہؐ کسی فرد کو جنت میں بھیجنے کی ضمانت نہیں دیتے تو پھر دوسرے کسی فرد کو کب سے یہ حق پہنچ گیا کہ وہ سب کو جنت میں داخل کر دے۔ گزشتہ زمانوں میں بہت سی غیر اسلامی باتیں اسلام میں گھس آئی ہیں۔

مگر یاد رکھو:

- جو بات قرآن میں ہے وہ اسلام ہے۔
- جو بات سنتِ رسولؐ میں ہے وہ اسلام ہے۔
- جس بات پر صحابہؓ اور تابعینؒ نے عمل کیا وہ اسلام ہے۔
- جو بات اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہے وہ اسلام ہے۔

اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ بعد کے لوگوں کے اضافے ہیں، جن کی کوئی سند نہیں، وہ ہرگز اسلام نہیں ہے۔

(حذف و اضافہ کے ساتھ۔ "ترجمان القرآن" دسمبر ۱۹۸۷ء سے ماخوذ)

شریف احمد مبارکپوری

اقبالؔ کی نظر میں عورت کا مقام

اردو شعراء بھی فارسی شاعری کی تقلید میں عورت کے بارے میں انھیں فرسودہ مضامین کا اعادہ کرتے چلے آرہے تھے جن میں صنف لطیف جیسی پاکیزہ مخلوق کو محض ہوس رانیوں کا ذریعہ سمجھا گیا اور اس میں اگر کوئی خوبی نظر آئی تو صرف اس کا ظاہری حسن و جمال۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی اس کے رخسار کو مہتاب سے تشبیہ دی گئی تو کبھی اس کی زلف کو ناگن کہا گیا۔ الغرض عورت کو بے نقاب کر کے اس کی تصویر عریاں کرنے کو ہی شاعری کا معراج قرار دیا گیا۔

لیکن شاعری نے ایک کروٹ لی اور پرانی روش سے ہٹ کر ایک نئے راستہ پر جا پڑی جس میں گل و بلبل اور لب و رخسار کے بجائے زندگی سے قریب تر حقائق کی تلاش ہوئی۔ ایسی شاعری کرنے والوں کی بھی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں خاص طور سے حالی اور اقبال قابل ذکر ہیں جن کے یہاں عریانیت اور فحاشیت نہیں ملتی بلکہ اس کے برخلاف عورت کے مقام و مرتبہ کا بھرپور احترام اور پاس و لحاظ کیا گیا ہے۔

اقبال عورتوں کے لئے وہی طرز حیات پسند کرتے ہیں جو صدر اسلام میں پایا جاتا تھا جس میں مروجہ تمام جنسی بے قید ہوتے ہوئے بھی ستر و پردگی میں آج سے کہیں زیادہ بہتر تھا۔ عورت کو اس کا صحیح مقام عطا کیا۔ ۱۹۱۲ء میں طرابلس کی جنگ میں عرب کی ایک لڑکی فاطمہ بنت عبداللہ غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی تو اقبال نے کہا ؎

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے ‏ ‏ ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت، حورِ صحرائی! تری قسمت میں تھی ‏ ‏ غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر ‏ ‏ ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی ‏ ‏ ایسی چنگاری بھی یا رب، اپنی خاکستر میں تھی

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں ‏ ‏ بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں
فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے ‏ ‏ نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے ‏ ‏ ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں ‏ ‏ پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

دوسری جگہ ایک اور فاطمہ ہمشیرہ حضرت عمرؓ کا واقعہ پیش کیا ہے جس کا تاریخ اسلام میں بڑا مقام ہے بلکہ اس اہم کارنامے سے اسلام کو بڑی تقویت پہنچی ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ جب حضرت عمرؓ مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے اور ابوجہل کے شانہ بشانہ چل رہے تھے تو ایک روز یہ ارادہ کر کے گھر سے نکلے کہ آج (نعوذ باللہ) پیغمبر دین اسلام محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا کام تمام کر کے سکون لوں گا تاکہ قریش میں جنم لینے والا یہ فتنہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ راستے میں اتفاقاً نعیم بن عبداللہ مل گئے۔ ان کے تیور دیکھ کر انھوں نے پوچھا کہ خیریت تو ہے؟ بولے: آج محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا کام تمام کرنے جا رہا ہوں۔ انھوں نے کہا: پہلے اپنے گھر کی خبر لو، خود تمہارے بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں۔ پلٹ کر وہ اپنے بہنوئی کے مکان پر پہونچے۔ اس وقت ان کی بہن قرآن پڑھ رہی تھیں۔ آہٹ پاتے ہی انھوں نے قرآن کے اجزا کو چھپا لیا لیکن آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ باز پرس کرنے کے بعد اپنے بہنوئی کو مارنا شروع کر دیا۔ حضرت فاطمہؓ اپنے شوہر کو بچانے کی خاطر لپٹ گئیں۔ عمر نے ان کو اتنا مارا کہ جسم لہولہان ہو گیا لیکن وہ بھی تو عمر ہی کی بہن تھیں، ان کے اندر بہادری کا جذبہ بیدار ہوا، بولیں: عمر! جو بن آئے کرو، لیکن اسلام اب دل سے نہیں نکل سکتا۔ ان الفاظ نے حضرت عمرؓ کے دل پر گہرا اثر کیا۔ وہ سیدھے دار ارقم پر پہونچے جہاں آفتاب رسالت ضیاء بار تھا، اور مشرف با اسلام ہو گئے۔

شاعر مشرق جناب علامہ اقبال نے فاطمہؓ کے اس واقعہ سے متاثر ہو کر کیا خوب کہا ہے جس پر جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے کہ بہنیں بھی جہاد کر سکتی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں ؎

ز شام ما برون آور سحر را ‏ ‏ بہ قرآن باز خوان اہل نظر را
تو می دانی کہ سوز قراءت تو ‏ ‏ دگرگوں کرد تقدیر عمرؓ را

اقبال کی نظر میں عورت کا شرف و امتیاز اس کے ماں ہونے کی وجہ سے ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فطری نظام میں جذبۂ امومت اصل کو وجود رکھتا ہے اور اس کے فیض سے نسلی تسلسل برقرار

جلوہ گر ہے۔ جس طرح گھر سے باہر کی زندگی میں مردوں کو فوقیت حاصل ہے بعینہ عورتوں کو گھر پر مقام تسلط حاصل ہے۔ انسانیت کا پہلا مدرسہ ماں کی گود ہی ہے۔ اس کی تربیت و پرداخت جیسے طریقے ڈھنگ سے ہوگی اتنا ہی شائستہ، مہذب ہوگا اور اس کا ایسا ٹھوس ثبوت پیش کیا ہے کہ دنیا کا کوئی فرد جو چشم بینا رکھتا ہے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ کہتے ہیں:

وہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

اسی لئے وہ آزادیٔ نسواں کی تحریک کے حامی نہیں کہ اس کا نتیجہ دوسرے الفاظ میں عورتوں کی غلامی اس طریقہ کار سے انسانیت کا بہت بڑا نقصان ہوگا، جذبۂ امومت ختم ہو جائے گا۔ ماں کی ممتا کی روایت کمزور پڑ جانے کی جس کا بیان بڑے اچھے پیرائے میں کیا گیا ہے:

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کیلئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کیلئے علم و ہنر موت

علامہ اقبالؒ حضرت فاطمہ زہراؓ کو ملت اسلامیہ کی ماؤں کے لئے مثالی خاتون کہتے ہیں کہ وہ کس طرح چکی پیستے ہوئے بھی تلاوتِ قرآن پاک اور ذکر و فکر میں مشغول رہتی تھیں اور گھر کے سارے کام کاج حسن و خوبی انجام دیتی تھیں۔ اقبالؒ کے خیال میں سیرت کی اسی پختگی سے حضرات حسنینؓ ان کی آغوش سے نکلے:

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ
آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گرداں و لب قرآں سرا
فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوۂ زہرا مبند
تا حسینےؓ شاخ تو بار آورد
موسمِ پیشیں بہ گلزار آورد

وہ مسلم خاتون کو نصیحت کرتے ہیں کہ اگر آج بھی تم ان باتوں پر عمل پیرا ہو جاؤ تو تمہارا کھویا ہوا مقام تم کو واپس مل جائے گا اور تمہاری زندگی دنیا کی عورتوں کے لئے نمونے کی زندگی ہوگی۔۔۔

مضمون خوش خط اور ورق کے صرف ایک طرف لکھیں

قطب شہید کا نظریہ اعجاز القرآن

محمد [illegible]

معنوی اور غیر محسوس چیزوں کی تعبیر:

معنوی اور غیر محسوس شئی کی تعبیر قرآن محسوس شکل میں اس طرح پیش کرتا ہے:

"ان الذین کذبوا بآیاتنا و استکبروا عنها لا تفتح لهم ابواب السماء ولا یدخلون الجنة حتی یلج الجمل فی سم الخیاط" (الاعراف ۴۰)

"یقیناً جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے اعراض کرتے ہوئے استکبار نفس میں مبتلا ہوئے ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہو سکیں گے تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے۔"

یہاں قرآن مجید اہل کفر کی عدم مقبولیت کا تذکرہ کرتا ہے کہ وہ سرے سے جنت میں داخل نہ ہو سکیں گے۔ ان کی مقبولیت اور جنت میں دخول امر محال ہے۔ یہ ایک معنوی چیز ہے لیکن قرآن اسے تصویر کے انداز میں پیش کرتا ہے اور مخاطب کو چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنے تصور و خیال میں جنت کے دروازوں کے مقفل ہو جانے اور اونٹ کے سوئی کے ناکے میں گھسنے کی تصویر کشی کرے پھر انسانی نفس کی گہرائیوں میں اہل کفر کی قبولیت کے محال ہونے کا مفہوم پوری طرح جاگزیں ہو سکتا ہے۔

ایک دوسری آیت میں قرآن مجید کفار کے اعمال کے رائیگاں جانے کا تذکرہ بعینہ اسی اسلوب میں کرتا ہے:

"مثل الذین کفروا بربهم اعمالهم کرماد اشتدت به الریح فی یوم عاصف لا یقدرون

جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کی روش اختیار کی ان کے اعمال کا حال اس خاک سیاہ کا سا ہوگا جسے تیز و تند آندھی والے دن میں ہوا اڑا لے، پھر جو کچھ انہوں نے

۱؎ فصل، التصویر الفنی ص ۳۴-۳۵

شیئٍ مما کسبوا"	کمائی کی ہے اس میں سے کچھ بھی نہ پاسکیں۔"

غور کیجیے اس آیت میں کفار کے اعمال ضائع ہو جانے کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، وہ کس قدر زندگی اور حرکت سے بھرپور ہے جس طرح راکھ کا ڈھیر باد تند گزر جانے سے چشم زدن میں ہواؤں کے دوش بدوش ادھر ادھر بکھر جاتا ہے، اسی طرح روز قیامت کفار کے وہ اعمال جو انھوں نے خیر کی راہ میں کیے ہوں گے ان کی کوئی حیثیت و وقعت نہ ہوگی اور ایسے اعمال کا تودہ بھی ایک تند ہوا کے چل جانے سے اسی طرح فضاؤں میں تحلیل ہو جائیگا۔

سورہ آل عمران میں بھی اللہ تعالیٰ نے اہل کفر کے نیک اعمال کی بربادی کی تمثیل بیان کی ہے وہ اس مفہوم کو اور واضح انداز میں پیش کرتی ہے فرمایا:

"مثل ما ینفقون فی ھذہ	"اس دنیا کی زندگی میں ان کے انفاق
الحیاۃ الدنیا کمثل ریح	کا حال اس ہوا کا سا ہے جس میں پالے
فیھا صر اصابت حرث	ہوں جو ایسے لوگوں کی کھیتی سے گزر
قوم ظلموا انفسھم	جائے جنھوں نے اپنے اوپر ظلم ڈھایا ہو،
فاھلکتہ" ۱۱۷	اور پھر اسے پوری طرح تہس نہس کر دے"

سید قطبؒ فرماتے ہیں کہ قرآن نے یہاں ایک ایسی کھیتی کی نقشہ کشی کی ہے جس کی ساری پیداوار تالہ بار ہواؤں کی نذر ہو جائے اور کاشتکار اپنی پیہم محنتوں کے ثمرہ سے محروم رہ جائے، یہی حال اہل کفر کا بھی ہوگا جنھوں نے فی سبیل الخیر انفاق اموال کر کے خیر کی توقع کی تھی لیکن کفر کی تالہ باد ہوائیں ان کی ساری امیدوں، وتمناؤں کی لہلہاتی کھیتی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیں گی۔

سید صاحبؒ نے لفظ "صرّ" کے صوتی آہنگ اور اس کے تلفظ میں جو شدت پائی جاتی ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ لفظ اپنے معنی کی شدت پر دال ہے اور اس کے مدلول کی جو تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی کھیتی پر چھوٹے چھوٹے ڈگوں کی بارش ہو رہی ہے جو اسے یکسر تباہ و برباد کئے جا رہی ہے۔

نفسیاتی اور ذہنی کیفیات کی تصویر: توحید کے شاہراہ مستقیم چھوڑ کر شرک کی پگڈنڈیاں اختیار کرنے والے پر حیرانی و سرگشتگی کی ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس کا دل متعدد خداؤں اور دیوی دیوتاؤں کی تابعداری و اطاعت میں بٹ جاتا ہے، اس پراگندہ دلی اور ذہنی انتشار کی کیفیت کے تسلط کے ساتھ ہی جب توحید پرست افراد اسے خالص خدا کی غلامی اور اسی کی اطاعت و فرمانبرداری کی دعوت دینا شروع کرتے ہیں تو اب اس کے سامنے توحید و شرک کے دو مختلف سمتوں میں لے جانے والے راستے پیدا ہو جاتے ہیں، ان میں سے پہلی راہ تو وہ ہے جو بدون واسطہ خالق کائنات سے رشتہ استوار کرتی ہے جب کہ دوسری راہ انسان کو ایک ایسے وسیع و عریض صحرا میں ڈال دیتی ہے جس میں بجز سرگردانی اور حیرانی و پریشانی کے اور کوئی چارہ کار نہیں اور جس کا آخری اور حتمی انجام ہلاکت و بربادی ہے، ایسے شخص پر توحید و شرک کی ان دونوں راہوں میں سے کسی ایک کے انتخاب و ترجیح کے سلسلے میں تردد و تذبذب کی جو ایک نفسیاتی کیفیت طاری ہوتی ہے قرآن اسے ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

"قل أندعو من دون	"اے نبی کہہ دیجئے کیا ہم اللہ کو چھوڑ
اللہ ما لا ینفعنا ولا یضرنا	کر ان معبودوں کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع پہنچا
ونرد علی اعقابنا بعد اذ	سکتے ہیں نہ نقصان اور پھر کہیں الٹے پاؤں
ھدانا اللہ کالذی	پھیر دیا جائے جب کہ اللہ نے ہمیں سیدھی
استھوتہ الشیاطین	راہ دکھا دی، اس شخص کے مانند جسے شیاطین
فی الارض حیران لہ اصحاب	نے زمین میں حیران و سرگشتہ کر دیا ہو جبکہ
یدعونہ الی الھدی ائتنا...	کچھ ساتھی اسے ہدایت کی طرف بلا رہے ہوں
... الآیۃ* الانعام ۷۱	کہ آؤ ہمارے پاس....."

سید قطبؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اس بدقسمت اور بدبخت انسان کی تصویر پوری طرح عیاں ہے جس پر شیاطین نے حیرانی و پریشانی کی کیفیت مسلط کر دی ہے، یہ انسان یقیناً اس وقت خوش قسمت ہوتا جب کہ وہ ایک ہی راہ پہ گامزن ہونا چاہیے۔

وہ گمراہی کی ہی راہ کیوں نہ ہو لیکن شومئ قسمت دوسری طرف سے اس کے ہی بعض بھائی بند اُن ہدایت کی شاہراہ پہ چلنے کی اسے دعوت دے رہے ہیں، وہ کشمکش و پیچ اور حیص بیص میں مبتلا ہے کہ آیا وہ شرک کی وادیوں میں بھٹکتا رہے یا اپنے ان توحید پرست ساتھیوں کی دعوت پر لبیک کہے۔[1]

قرآن کے انسانی نمونے: قرآن اس بات کو بیان کرنا چاہتا ہے کہ انسان پر جب کوئی تنگ گھڑی آتی ہے یا جب وہ کسی خوفناک مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو خدا کو یاد کرتا ہے لیکن جب اس سے یہ مصیبت دور کر دی جاتی ہے تو ناشکری اور احسان فراموشی کا رویہ اختیار کر لیتا ہے۔ اس انسانی فطرت کی نقاب کشائی میں ذہنی نسق و ترتیب سے ہٹ کر قرآن زندگی، حرکت اور پے در پے نمودار ہونے والے مناظر سے بھرپور ایک تصویر پیش کر دیتا ہے اور اس طرح بنی نوع انسان میں ہمیشہ پیش آنے والی انسانی فطرت کا ایک نمونہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

هو الذی یسیرکم
فی البر والبحر حتی اذا
کنتم فی الفلک، وجرین
بهم بریح طیبة وفرحوا
بها جاءتها ریح عاصف
وجاءهم الموج من کل
مکان وظنوا انهم احیط
بهم دعوا الله مخلصین
له الدین: لئن انجیتنا من
هذه لنکونن من الشاکرین
فلما انجاهم اذا هم۔

اور وہی ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتیوں پہ سوار ہوتے ہو اور یہ کشتیاں انہیں لے کر باد موافق کے دوش بدوش رواں دواں رہتی ہیں اور وہ اس سے بڑے شاداں و فرحاں ہوتے ہیں تو دفعتاً ایک تیز و تند ہوا چل پڑتی ہے اور ہر طرف سے موجیں انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں اور انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ اس مصیبت میں گھر گئے تو اس وقت یہ لوگ مخلصانہ اطاعت کے ساتھ خدا سے دعا گو ہوتے ہیں

[1] ایضاً ص ۷۰ - ۷۱

یبغون فی الارض بغیر الحق" سورۃ یونس ۲۲

کہ اگر اس نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دی تو ہم ضرور اس کے شکر گزار بندے بن جائیں گے لیکن جب وہ انہیں نجات دے دیتا ہے تو اسی دم زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔"

غور کیجئے کہ اہل کفر کی ناشکری و احسان ناشناسی کی یہ تصویر کس حد تک زندگی اور حرکت سے معمور ہے۔ سمندر کی تلاطم خیز موجوں میں کس قدر اتار چڑھاؤ نظر آتا ہے اور کس طرح وہ کشتیوں کو ڈانوا ڈول کرتی رہتی ہے۔ پس اب یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ قرآن معنوی اشیاء، نفسیاتی کیفیات اور انسانی نمونے کو اپنے خاص اسلوب میں چلتی پھرتی متحرک تصویروں کی شکل میں پیش کرتا ہے اور مجرد تعبیر کے بجائے ان میں تصویر کا رنگ بھر دیتا ہے۔

قرآنی سرگزشتیں: واقعات اور سرگزشتوں کے بیان میں بھی قرآن نے منظر کشی کا وہی اسلوب اپنایا ہے جس میں ظاہری حرکت اور پوشیدہ احساسات کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بطور مثال سورۃ آل عمران کی یہ آیت ملاحظہ ہو جس میں اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد میں مسلمانوں کی عارضی شکست کا تذکرہ فرمایا ہے:

"ولقد صدقکم الله
وعده اذ تحسونهم باذنه
حتی اذا فشلتم وتنازعتم
فی الامر ... الی قوله قتلنا ههنا"
۱۵۲ — ۱۵۴

"اللہ تعالیٰ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا جب کہ تم اس کی توفیق سے انہیں تہ تیغ کر رہے تھے یہاں تک کہ جب تم نے بزدلی دکھائی اور معاملے میں اختلاف کر بیٹھے اور تم نے نافرمانی کی بعد اس کے کہ اللہ نے تمہیں تمہاری پسندیدہ چیز (یعنی فتح و نصرت) دکھا دی تھی تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کے خواستگار، پھر اللہ نے تمہارا رخ ان سے پھیر دیا تاکہ تمہیں آزمائش میں ڈالے، اور اس نے تم سے درگزر کیا اور اللہ مومنین پر بڑا مہربان ہے، یاد کرو اس وقت کو جب کہ تم بگٹٹ بھاگے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے حالانکہ رسول تمہیں پیچھے سے پکار رہا تھا، نتیجتاً اللہ نے تمہیں غم پر غم سے دوچار کیا تاکہ تم مال و سامان

نقصان پہ افسوس نہ کرو اور اللہ تمہارے کئے سے باخبر ہے پھر اس نے غم کے بعد تم پر سکینت نازل کی جیسی غنودگی جو تم میں سے ایک گروہ پہ طاری ہو رہی تھی اور ایک گروہ کو اپنی جانوں ہی کی پڑی تھی۔ وہ خدا کے بارے میں جاہلیت کے غلط تصورات قائم کر رہے تھے کہتے تھے کہ کیا ہمیں اس معاملہ میں کوئی اختیار ہے۔ اے نبی کہہ دیجئے کہ فیصلے کا تمام تر اختیار اللہ کو ہے یہ اپنے دلوں میں وہ باتیں چھپائے ہوئے تھے جنہیں ظاہر کرنے سے کتراتے تھے کہتے پھرتے تھے کہ اگر ہمیں بھی اس معاملہ میں کچھ اختیار ہوتا تو اس طرح ہم یہاں تہ تیغ نہ کئے جاتے۔"

مناظر قیامت کی نقش کشی: قیامت کے ہولناک مناظر اور انسانوں پر مسلط خوف و ہراس اور سراسیمگی کی کیفیت کی نقش کشی میں بھی قرآن مجید کی فنی تصویر کا کافی دخل ہے سورۃ قمر کی درج ذیل آیت ملاحظہ ہو:

يوم يدع الداع إلى شيء نكر، خشعا أبصارهم يخرجون من الأجداث كأنهم جراد منتشر، مهطعين إلى الداع يقول الكافرون هذا يوم عسر" (سورۃ القمر ۶-۸)

"جس روز پکارنے والا ایک ناشناختہ امر کی طرف بلائے گا، اس حال کہ ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی، وہ پراگندہ ٹڈیوں کی مانند اپنی قبروں سے نکلیں گے اس پکارنے والے کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے کفار کہیں گے یہ دن بڑا کٹھن دن ہے۔"

سید قطبؒ اس آیت کا ذکر کرنے کے معاً بعد یوں رقم طراز ہیں:

"یہ قیامت کے مختلف مناظر میں سے ایک ہے اگرچہ بالکل مختصر اور سریع الخطوات ہے لیکن اپنی جملہ حرکات اور علامات کے اعتبار سے کامل ہے۔ انسانوں کے غول جیسے بیک وقت قبروں سے نکلیں گے ایسا معلوم ہوگا کہ جیسے ٹڈیاں [illegible] پھیلی ہوں (ٹڈیوں کے خروج کا جو منظر ہمارے ذہنوں میں موجود ہے اس سے اس عجیب و غریب منظر کا تصور قائم کرنے میں مدد ملتی ہے) انسانوں کے یہ انبوہ در انبوہ طبقے اس پکارنے والے کی طرف تیزی سے بھاگیں گے اور وہ اس سے بالکل بے خبر ہوں گے کہ اس پکار کا مطلب کیا ہے۔ خشعا أبصارهم نے اس تصویر کو مکمل

(بقیہ صفحہ پر)

بکھر دیا۔ دریں اثنا وہ کہیں گے ھذا یوم عسر۔"

قیامت کے اس منظر کا کوئی پہلو ایسا نہیں رہا جس کا بھرپور نقشہ ہماری نگاہوں میں نہ آگیا ہو۔ دہشت و خوف کا اس روز جو عالم ہوگا اس کی مکمل تصویر پوری طرح آشکار ہے۔

خلاصہ بحث: سید قطب شہیدؒ کے تصور اعجاز القرآن کا خلاصہ یہ نکلا کہ قرآن کے اسلوب بیان اور طرز تعبیر میں تصویر کشی کا پہلو نمایاں اور غالب ہے چنانچہ وہ اپنے مختلف اغراض و مقاصد کے بیان میں مجرد اور سادہ اسلوب اختیار کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس میں نقشہ کشی کا بھی رنگ بھر دیتا ہے، جس طرح ایک ماہر فنکار اپنی قدرتی صلاحیتوں سے کسی کیفیت اور حالت کی عکاسی میں مختلف رنگوں کا سہارا لے کر اس کی تصویر کو زندگی، حرکت اور قوت گویائی سے آراستہ کر دیتا ہے، اسی طرح قرآن بھی الفاظ و کلمات کا سہارا لے کر اسی طرح کی زندگی اور حرکت پیدا کر دیتا ہے، ایک مصور اپنے فن میں ناقص اور ادھورا ہو سکتا ہے لیکن قرآن اپنے اسلوب میں فنی حسن و جمال کے اعتبار سے کامل ہے اور یہ چیز اس کے معجزہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

بقیہ ص ۲۸: حضرت عمرو بن جموحؓ

اور اس کی خوشبو مشک کی خوشبو کی طرح ہوگی۔" پھر فرمایا "عمرو بن جموح کو عبداللہ بن عمرو کے ساتھ دفن کرنا، یہ دونوں اس دنیا میں ایک دوسرے کے نہایت گہرے اور مخلص دوست تھے۔"[۱]

اللہ تعالیٰ حضرت عمرو بن جموح اور ان کے ساتھی شہدائے احد سے راضی ہو اور ان کی قبروں کو نور سے بھر دے۔ آمین

۱۔ ایضاً

تبسّم .... رسول پوری

غزل

حیاتِ اُخروی کو اپنی جو منزل سمجھتے ہیں
حصولِ نانِ دنیا کو وہی باطل سمجھتے ہیں

جو اہلِ عزم ہیں مشکل کو بھی مشکل نہیں کہتے
نکمّے لوگ ہر آسان کو مشکل سمجھتے ہیں

جو بازو امن کا پرچم اٹھائیں مصلحت لے کر
ہم ایسے بازوؤں کو بازوئے قاتل سمجھتے ہیں

زمانہ ان کے استقبال کو بے چین رہتا ہے
جو ماضی سے بھی بڑھ کر اپنا مستقبل سمجھتے ہیں

یہ جب ہو موجزن تو تشنہ لب سیراب ہو جائیں
لہو کا ایک قطرہ ہے جسے ہم دل سمجھتے ہیں

کبھی منجدھار میں دریا بھی لنگر ڈال دیتا ہے
جو ناداں ہیں اسی ٹھہراؤ کو ساحل سمجھتے ہیں

کتابیں چند پڑھ ڈالو کہ اک کب میں بسو جا کر
ہم ایسی کوششوں کو علم کا حاصل سمجھتے ہیں

جو فتنے دیکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں دنیا میں
تبسّم فتنہ گردوں میں ہم انھیں شامل سمجھتے ہیں

• •

مجاہد کھیم پوری

آدمی

شہر تنگ آدمی، ہر ڈگر آدمی
پھر بھی لگتا ہے تنہا مگر آدمی

فکر مجرم ہے اور ذہن بیمار ہے
جا رہا ہے نہ جانے کدھر آدمی

کر کے تعمیر کل نفرتوں کا جہاں
خود جلاتا ہے اپنا ہی گھر آدمی

یوں تو کہنے کو سب آدمی ہیں مگر
پھر بھی آیا نہ کوئی نظر آدمی

کس کو اپنا کہیں کس سے پرسش کریں
کون ہے آج کل معتبر آدمی

منزلیں خود بخود قدموں میں آ جائیں گی
دل میں کر لے جو عزمِ سفر آدمی

کو ملتا ہے وہ تاجِ سروری
ہو بڑھیا جیسا مگر آدمی

سیکھ کر پھر سے انسانیت کا سبق
آدمی کاش بن جائے ہر آدمی

بعد مرنے کے کیا تیرے کام آئے گا
یہ بھی سوچا کبھی بے خبر آدمی

ہے مجاہد یہ تہذیبِ نو کا اثر
جس میں ڈھل کر بنا جانور آدمی

مفتی عبدالرؤف سابکپوری

نس بندی کے احکام

اختصار کے لئے سوال حذف کر دیا گیا ہے۔

آپ کے جواب اپنی خوشی و رضا سے نس بندی کرا لینے والے امام کی امامت کے بارے میں اختلاف ہونے کا صاف مطلب یہ ہے کہ کم از کم ایک گروہ نس بندی کی شرعی حیثیت سے بالکل واقفیت نہیں رکھتا، مزید سمجھنے کے بعد نس بندی کی قرآن و حدیث کی رو سے کیا حیثیت ہے۔ خلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔ لہذا اس مسئلہ کے متعلق جواب الجواب نہیں مناسب نہیں ہوگا، اس لئے پہلے یہ سمجھئے کہ نس بندی کے بارے میں شریعت اسلامیہ کیا کہتی ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے اس لئے مختصراً ملاحظہ کیجئے:

برضا و رغبت نس بندی کرانا گویا اللہ تعالیٰ شانہٗ کی بنائی ساخت کو بدلنا، ان قوتوں فطرت کو توڑنا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جاری کیا ہے۔ دراصل یہ ایک شیطانی فعل ہے اور شیطان ہی اس فعل کی تعلیم دیتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ: ولآمرنهم فليغيرن خلق الله "شیطان نے کہا کہ میں اولاد آدم کو حکم دوں گا تو وہ اللہ کی بناوٹ کو بدل ڈالیں گے۔" اور شیطان کے بارے میں قرآن میں ہے: انما يامركم بالسوء والفحشاء۔ "جس کی نیت کہ وہ تم کو (بدی) اور بے حیائی کے کام کا حکم دیتا ہے۔" اللہ تعالیٰ نے جن مقاصد کے لئے مرد و زن کے یہ اعضاء بنائے ہیں، اگر انہیں اس طرح کاٹ دیا جائے کہ ان سے وہ نتائج برآمد نہ ہو سکیں تو کیا یہ خلق اللہ کی کھلی ہوئی تغییر نہیں ہوگی، کیا یہ سود و فساد کا ارتکاب نہیں ہے، کیا اس کو شیطانی فعل نہیں کہا جائے گا۔ ظاہر ہے، ان میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ حدیث کے اندر بھی اس سلسلے میں کھلی ہوئی ہدایات و احکام موجود ہیں۔ ایک بار صحابہ کرامؓ نے گناہوں سے بچنے اور دنیا سے بے فکر ہو کر عبادت میں مشغول رہنے کی نیت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اختصاء (خصی ہونے) کی اجازت مانگی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی اور قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

يايها الذين امنوا لا تحرموا طيبت ما احل الله لكم ولا تعتدوا ان الله لا يحب المعتدين۔ "پاکیزہ چیزوں کو جن کو اللہ نے تمہارے لئے حلال کیا ہے، حرام مت کرو اور نہ حد سے تجاوز کرو۔ بلاشبہ اللہ تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

صاف معلوم ہوا کہ نس بندی (قطع نسل کا عمل) نص قرآنی سے بھی حرام ہے، اور یہ فعل حدود اللہ سے تجاوز میں داخل ہے۔ ایک دوسری جگہ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ومن يتعد حدود الله فقد ظلم نفسه۔ "اور جس کسی نے اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کیا اس نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔" اور درمختار مع الشامی صفحہ ۳۲۳، ج ۵ میں لکھا ہے: اما خصاء الآدمي حرام۔ "انسان کا خصی ہونا حرام ہے۔"

پس اسلام نے جس قاعدے پر اپنے نظام معیشت و معاشرت اور نظام تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی ہے وہ یہ ہے کہ انسان انفرادی اور مجموعی حیثیت سے اپنی فطرت کے تمام مقتضیات کو ٹھیک ٹھیک قوانین فطرت کے مطابق پورا کرے اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تمام قوتوں سے اس طرح کام لے جس کی ہدایت خود اللہ نے دی ہے۔ نہ کسی قوت کو معطل کر دیا جائے، نہ کسی قوت کے استعمال میں اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت سے انحراف کرے اور نہ شیطانی تحریف و تحریک سے گمراہ ہو کر اپنی فلاح و بہبود ان طریقوں میں تلاش کرے جو فطرت کی سیدھی راہ سے دور ہٹ گئے ہیں۔ حدیث شریف میں بھی لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق فرمایا گیا ہے۔ جس بات میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو اس میں کسی مخلوق کی اطاعت درست نہیں ہے۔

نس بندی کے بارے میں معلوم ہو گیا کہ یہ اعتداء و تعدی، تجاوز عن الحد، تغییر خلق اللہ اور امر شیطانی پر عمل کرنا نص قطعی سے ثابت ہوتا ہے، اس لئے اب آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ نس بندی کرانے والا گنہگار اور بڑا ظالم ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسوں کو پسند نہیں کرتا۔

اب رہا نس بندی یا نسل بندی کے اور تمام طریقوں کو ایک دوسرے طریقے سے قرآن و حدیث کی روشنی میں ملاحظہ کیجئے، مشکوٰۃ شریف کتاب النکاح صفحہ ۲۶۷ میں روایت ہے: عن معقل بن يسار قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم تزوجوا الودود الولود فاني مكاثر بكم الامم۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم بہت محبت کرنے والی بہت بچے جننے والی عورت سے شادی کرو، کیوں کہ میں تمہاری وجہ سے تمام امتوں پر فخر کروں گا کہ میری امت زیادہ ہے۔" اس حدیث میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ سے زیادہ اولاد پیدا کرنے کا ترغیبی حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ میں تمہیں اور امتوں کے درمیان اپنی امت کی کثرت پر فخر

ہوگا۔ ضبطِ تولید کے سلسلے میں کچھ لوگ عزل کو پیش کر کے غلط تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ عزل کے بارے میں جس قدر روایات ہیں ان کو جمع کر کے دیکھ لیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ضبطِ تولید کا ہر طریقہ بے فائدہ ہے۔ اس سے نسل اور تناسل میں کوئی کمی نہیں ہوسکتی جتنے بچے پیدا ہونے والے ہیں وہ تو تمام کے تمام پیدا ہو کر ہی رہیں گے کسی کے روکنے سے رک نہیں سکتے لہٰذا عزل بھی بیکار ہی ہے، ضرورت کی صورت میں جائز ہو سکتا ہے گو وہ خواہ ضبطِ تولید کے لئے بے سود ہے۔ چنانچہ امام مالکؒ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ بنی مصطلق میں ہمارے ہاتھ لونڈیاں آئیں اور اس وقت ہم پر اپنے اہل و عیال سے دوری شاق اور گراں گزر رہی تھی ہم نے ان عورتوں سے استمتاع کرنا چاہا اور دل میں یہ بھی خواہش تھی کہ ہم ان کو بعد میں فروخت کر دیں۔ اس وجہ سے ہم نے ان سے عزل کرنا چاہا تاکہ اولاد پیدا نہ ہو (کیونکہ اولاد کے بعد لونڈی ام ولد ہو جاتی ہے جو فروخت نہیں کی جاسکتی) جب ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ نے فرمایا: ما علیکم ان لا تفعلوا ما من نسمۃ کائنۃ الا وھی کائنۃ۔ اگر تم عزل نہ کرو تو تم پر کیا اثر پڑ جائے گا (تم خواہ کچھ بھی کرو) جو بچے پیدا ہونے والے ہیں وہ تو ہو کر ہی رہیں گے۔

صحیح مسلم میں ایک روایت ہے کہ جب عزل کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: لا علیکم ان لا تفعلوا ذالکم "تم پر کوئی مصیبت نہیں آجائے گی اگر تم ایسا نہ کرو۔"

ایک شخص نے اپنی لونڈی سے عزل کرنے کے بارے میں دریافت کیا تاکہ اس سے اولاد نہ ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعزل عنھا ان شئت فانہ سیاتیھا ما قدر لھا "تم چاہو تو عزل کر کے دیکھ لو اس کے باوجود جو بھی اولاد اس کے مقدر میں لکھی ہے وہ ہو کر رہے گی۔" ترمذی شریف کی ایک روایت میں ہے کہ صحابہ کرام میں جن لوگوں کو تفقہ فی الدین حاصل تھا وہ عزل کو مکروہ جانتے تھے۔ ان روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عزل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی عبث اور ناپسندیدہ فعل سمجھتے تھے۔ ضبطِ ولادت کے دوسرے طریقے جن میں تغییر خلق اللہ لازم ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہرحال حرام نہیں قرار دیئے ہیں تاکہ اضطراری صورتوں میں جواز باقی رہے۔ لیکن بلا ضرورت و اضطرار اس کو ایک عام طرز عمل اور قومی پالیسی بنانا، حکام سلاطین کے لئے منافی اور خلاف ہے جو لوگ عزل کی روایات سے علی العموم برتھ کنٹرول، ضبطِ تولید، نسبندی یا نسل بندی، نس بندی، اسقاط، اخراج رحم، تاخیر حمل وغیرہ کا کوئی طریقہ مطلقاً درست سمجھتے ہیں وہ گمراہی میں ہیں۔ آج تو حضرت اس دنیاوی ضبطِ تولید کی تحریک چلائی جارہی ہے کہ انسانی آبادی بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اگر بروقت اس سے کام نہ لیا گیا تو غذائی پیداوار ناکافی ہو کر رہ جائیں گی اور لوگ بھوکے مرنے لگیں گے یہ بات آبادیاں فاقوں کا

شکار ہو کر تباہ نہیں ہو جائیں گی۔ یہ خالص مادی نظریہ ہے جو مغرب اور منکرین اسلام کا ایجاد کردہ ہے جس کا تمام تر انحصار ان کے اپنے مرئی مشاہدے محدود تفکیر پر اسباب پر ہے۔ ان کے پاس اپنے مادی اسباب کے دائرے دیکھنے اور جاننے کے لئے آنکھ ہے نہ کوئی دوربین اور نہ کوئی ذریعہ ہے جس سے رزق و بقائے حیات کا راز آشکار ہو سکے۔ دیگر مذاہب میں سے تو صرف وہی لوگ اس گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں جو دہریت کے قائل ہو چکے جن کے پاس زندگی گزارنے کے لئے کوئی مستند و معتبر ضابطۂ حیات نہیں ہے جو ان کی صحیح رہنمائی کر سکے۔ اب اللہ کے نزدیک وہ بے پرواہ گنڈے والے حیرت ہے کہ بعض مسلمان بھی وہ بھی بہتے جارہے ہیں حتیٰ کہ بعض نے تو اپنی نس بندی بھی کرانے کی جہالت و حماقت کا ارتکاب کر ڈالا اور شیطانی علم کا اتباع کیا ہے حالانکہ مسلمانوں کے پاس قرآن و سنت کی صورت میں مہد سے لے کر لحد تک زندگی کے ہر ایک گوشے کے لئے مستند و مکمل ضابطۂ حیات، لائحہ عمل اور کافی و شافی ہدایات اور مشکلات کا دائمی حل موجود ہے۔

اب یہاں اہل دنیا کی رزق رسانی کے بارے میں قرآن مجید کی چند آیتیں ملاحظہ کیجئے جو دراصل ساری دنیا کے لئے اللہ کی ہدایات کا آخری اور حتمی سرچشمہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام نوع انسان اور روئے زمین کے تمام جانداروں کا رزاق اللہ ہی ہے۔ اس میں کسی اور کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ سورۂ ہود کی آیت ہے: وما من دآبۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا "زمین پر ہر ایک رینگنے والی چیز کا رزق اللہ ہی کے ذمہ ہے" سورہ عنکبوت کی ایک آیت ہے: وکاین من دآبۃ لا تحمل رزقھا اللہ یرزقھا وایاکم "اور کتنے رینگنے والے اپنی روزی اپنے ساتھ نہیں رکھتے اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی" اور سورہ طلاق کی آیت ہے: ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو اللہ سے ڈرتا ہے اس کو اس طرح سے روزی دیتا ہے کہ وہ سمجھ نہیں پاتا کہ کہاں سے ملی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ایسا رزق دینے والا اور خالق ہے کہ ماں کے شکم میں اس جنین کو بھی غذا پہنچاتا ہے کہ جسے نہ کھانے پینے کا شعور ہے نہ رزق حاصل کرنے کا ڈھنگ اور جب اس کو شکم مادر کی محدود دنیا سے باہر لاتا ہے تو پہلے سے ہی اس کے رزق کے لئے ماں کی چھاتیوں کو عمدہ لطیف اور بچے کے مزاج کے مطابق مقوی غذا سے بھر کر تیار رکھتا ہے۔ یہ ہے اس کی روزی رسانی کا عالم کہ جہاں رزق کی خاطر اپنی جدوجہد اور سعی و اکتساب سے حاصل کرنے کی کوئی قابلیت بھی نہ کوئی صورت دیا جاتا تو ماں نے اپنا باقاعدہ طور پر روزی پہنچائی کہ عقل انگشت بدنداں ہے۔ تو کیا جب بچے بڑے ہو کر کچھ کرنے کھانے کے

لاحق ہو جائیں گے، اور رزق کے لئے تگ و دو کرنے لگیں گے تو ان کو روزی نہیں ملے گی؟" بریں عقل و دانش بباید گریست۔"

اللہ تعالےٰ سورۂ انعام میں فرماتا ہے: لا تقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم وایاھم "تم تنگی اور مفلسی کی وجہ سے قتل مت کرو، ہم تم کو روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔" اور سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقھم وایاکم۔ "تم اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل مت کرو، ہم ان کو بھی روزی دیتے ہیں اور تم کو بھی۔"

ان دونوں آیتوں میں غربت و افلاس کی وجہ سے قتل اولاد سے صراحۃً روکا گیا ہے کہ تمہاری اور ان کی روزی تو اللہ کے ذمے ہے، تم قتل مت کرو، روزی دینا تو ہمارا کام ہے۔ اسی طرح ابھی جو نطفے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ ابھی شکم اور نطفۂ پدر میں ہیں جن کی ولادت یا استقرار حمل متوقع ہے، ان کے عالم وجود میں آنے سے روکنے کی جو تدبیریں کی جا رہی ہیں وہ محض اس لئے کہ مستقبل قریب میں غذا کی قلت و فقدان کا باعث بنیں گی۔ ان خدشوں اور تدبیروں کا بے بنیاد باطل ہونا ان آیات و احادیث سے ثابت ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے دیکھ لیں۔ آج کل شرح پیدائش گھٹانے یا حرام کاریوں کی رسوائی سے بچنے کے لئے جنین کا (بچے کا) جو پیٹ یا شکم مادر میں ہے، اسقاط کے ذریعہ یا پیدائش کے بعد کسی اور طرح سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، یہ قتل عمد ہے اور کبیرہ گناہ ہے۔ اگر وہ بچہ کسی مسلمان کا ہے تو اس کے قاتل چاہے خود اس کی ماں باپ ہوں یا کوئی اور دائی جنائی یا ڈاکٹر یا کوئی بھی ہو قاتل جہنمی ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: ومن یقتل مومنا متعمدا فجزاؤہ جھنم۔ الخ "جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے اس کی جزا جہنم ہے۔" مومن یا مومنہ کا بچہ بھی مومن ہوتا ہے، خواہ وہ کسی طرح سے ہوا ہو یا زنا سے۔ اس کو پیدائش کے بعد قتل کریں یا پیدائش سے پہلے پیٹ کے شکم ہی میں۔ ہاتھ کے ذریعہ قتل کریں یا کسی دھار دار چیز سے، اسقاط کی رو سے قتل کریں یا شکوک اشیاء سے آپریشن کر کے اس کی جان لیں یا زہر دے کر، یہ قتل مسلم یا نفس ڈاکٹر کرے یا کوئی عامی، یہ سب قتل عمد ہے۔ سب کا یکساں حکم ہے۔

ضبط تولید کے سلسلے میں یا زنا کی رسوائی سے بچنے کے لئے قتل جنین و اولاد عام ہوتا جا رہا ہے۔ حکومت کا بھی رجحان ایسے قاتلوں کو چھوٹ دینے کی طرف ہے جو نہایت خطرناک رجحان ہے اور دنیا کی تباہی اور آخرت کے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔

اب جبکہ نسبندی کی شرعی قباحت و شناعت آپ کو معلوم ہو گئی تو انہی باتوں کے بعد نسبندی کرانے والے امام کی امامت کو لیجئے۔ امامت کا مسئلہ بھی دراصل بڑا اہم ہے۔ ابوداؤد شریف کی روایت میں ہے:

ان رجلا امّ قوما فبصق فی القبلۃ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینظر فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین فرغ لا یصلی لکم فاراد بعد ذالک ان یصلی لھم فمنعوہ واخبروہ بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فذکر ذالک لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال نعم وحسبت انہ قال انک آذیت اللہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (ابوداؤد شریف ص۶۶، ج۱)

"ایک شخص نے لوگوں کی امامت کی پس قبلے کی طرف تھوک دیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دیکھ رہے تھے۔ جب نماز سے فرصت ہوئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اب تم کو نماز نہیں پڑھائے گا۔ اس کے بعد اس نے نماز پڑھانی چاہی تو لوگوں نے اسے روک دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی خبر اسے دی، تو اس نے اس بات کا ذکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے فرمایا ہاں میں نے کہا ہے۔ اور راوی کہتا ہے کہ میرا خیال ہے کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے اللہ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو قبلے کی طرف تھوک کر اذیت پہنچائی۔"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کو کتنا محتاط اور متشرع اور متقی ہونا چاہئے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف تھوکنے والے کے پیچھے نماز پڑھنے سے منع فرما دیا تو نسبندی کرانے والا تو قرآنی ہدایت کی رو سے تمام و معتدی اللہ کی پیدا کردہ ساخت کو بدلنے والا اور اللہ کی عطا کردہ نعمت کو حرام کرنے والا ہے۔ بھلا ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے اور اس کو امامت کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے۔ ابن ماجہ شریف ص۷۶ میں ہے: لا یؤم فاجر مومنا "کوئی فاجر کسی مومن کی امامت نہ کرے۔" اور کبیری میں لکھا ہے کہ: لو قدموا فاسقا یأثمون "اگر لوگوں نے کسی فاسق کو نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھایا تو گنہگار ہوں گے۔" اور شامی ص۵۲۳ ج۱ میں ہے: واما الفاسق فقد عللوا کراھۃ تقدیمہ بانہ لا یھتم لامر دینہ وبان فی تقدیمہ للامامۃ تعظیمہ وقد وجب علیھم اھانتہ شرعا۔ "فاسق جس کو آگے بڑھانا مکروہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دینی امور کا اہتمام نہیں کرتا ہے اور اس کو امامت کے لئے بڑھانے میں اس کی تعظیم لازم آتی ہے

حالانکہ اس کی اہانت لوگوں پر واجب ہے۔ (شامی)

پس ان تصریحات سے معلوم ہو گیا کہ نس بندی کرانے والا بھی دیگر فساق و فجار، ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔ اگر کوئی پڑھے گا، پڑھ لے گا تو گنہگار ہوگا اگرچہ نماز کراہت تحریمی کے ساتھ ہو جائے گی، جیسا کہ شامی صفحہ ۴۳۵، ج ۱ میں یہ بھی تحریر ہے کہ:

فان امکن الصلوٰۃ خلف غیرھم فھو افضل والا فالاقتداء اولیٰ من الانفراد۔

پس اگر نماز دوسرے کے پیچھے پڑھی جائے تو یہ افضل ہے ورنہ تنہا پڑھنے سے اس کے پیچھے پڑھنا اولیٰ ہے۔
اس طرح کے حوالے کے لئے صلوا خلف کل بر و فاجر آیا ہے۔

آپ کے امام نے تو اپنی مرضی سے اپنی نس بندی کر کے اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدل ڈالا اور اللہ کے عطا کردہ قانون فطرت کو توڑا اور شیطانی امر کا اتباع کیا۔ ایسے امام کے پیچھے نماز واقعی مکروہ تحریمی ہے اس کو امامت سے برطرف کر دینا چاہئے۔ جو لوگ اس امام کو اب بھی امام بنائے رکھنا چاہتے ہیں امر منکر کا ارتکاب کر رہے ہیں ان کو توبہ کرنی چاہئے۔ ہاں البتہ اگر کسی صاحب کی زبردستی پکڑ کر نس بندی کر دی گئی ہو جیسا کہ اندرا گاندھی سابق پرائم منسٹر کے ایمرجنسی پیریڈ میں بہت سے لوگوں کی بجبر و اکراہ نس بندی کر دی گئی ہے۔ ایسے مجبور و مکرہ اور مظلوم و آفت رسیدہ شخص کے پیچھے نماز ادا کرنا قطعاً کوئی کراہت کی بات نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔۔ ••

مجرم وفا کے ہم ہیں رعایت نہ کیجیے
اپنے کرم کی بھیک عنایت نہ کیجیے

گر ہے حقیقتوں سے نپٹنے کا حوصلہ
قائم تصورات کی جنت نہ کیجیے

ایسا نہ ہو کہ آنکھ سے آنسو ٹپک پڑیں
اظہار التفات کی زحمت نہ کیجیے

ہم سب کو دوستی کی ضرورت ہے اسلئے
کچھ بھی ہو نفرتوں کی حمایت نہ کیجیے

شعلے تعصبات کے بھڑکائیے نہ اور
تھوڑا سا جو سکون ہے غارت نہ کیجیے

منزل تو دور تھی اب ہے فقط جو چلنے کا
قربت کی بات و ذکر ملاقات نہ کیجیے

ہوتی ہیں کوششیں ہی کسی مسئلے کا حل
یہ زندگی حوالۂ قسمت نہ کیجیے

جو قرض آپ کا ہے کیے جائیے صدا
جو ہو رہا ہے اس کی شکایت نہ کیجیے

قاضی زین العابدین ——— استاذ جامعۃ الفلاح ۔ شعبۂ انگریزی و سیاسیات

الوداع اے ۲۰۰۸ء الوداع

میرے ٹیبل پر رکھی ہوئی خوبصورت ٹائم پیس نے ۳۰ دسمبر کی رات میں ٹھیک بارہ بجے الارم بجایا آج ہم نے خلاف معمول اسے دیر تک بجنے دیا۔ سب سے پہلے میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے عمر کی ۵۷ویں منزل عطا فرمائی اور میرے والدین کو بھی ۲۰۰۸ء کی ایک ساعت دیکھنا نصیب فرمایا۔

آج یکم جنوری ۲۰۰۹ء کی ایک ساعت شروع ہو چکی ہے۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ آج ہی میرا یوم ولادت ہے۔ لیکن اس میں خوشی کا کیا مقام، میری عمر کا ایک قیمتی سال گزر گیا۔ موت مجھ سے بغل گیر ہونے کے لئے ایک سال اور قریب آگئی۔ نہ جانے اب کتنی یکم جنوری کی ایک ساعتیں دیکھنی نصیب ہوں گی۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ لوگ سالگرہ کے موقع پر خوشیاں کیوں مناتے ہیں جب کہ سال "گرہ" سے چھوٹ رہا ہے اور موت قریب تر آرہی ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ اس ایک سال میں ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔

جامعۃ الفلاح (مدرسۃ النسواں) کی ایک سابق طالبہ میری عزیز شاگردہ، مدرسۃ النسواں کی ایک بہترین معلمہ مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب کی لاڈلی پوتی "فوزیہ" اللہ کو پیاری ہو گئی۔ سن ۲۰۰۸ء نے اسے ہم سے جدا کر دیا۔ جامعہ کے استاذ عبدالمالک صاحب کی والدہ محترمہ کو بھی ۲۰۰۸ء نے جامعہ کی درس گاہ کے قریب آخری قیام گاہ میں سلا دیا۔ مولانا احسان الحق صاحب ندوی اور مولانا اظہار محمد صاحب فلاحی مدنی کے والدین کے انتقال پر ملال کی خبریں بھی ۲۰۰۸ء ہی میں سنائی دیں!

یہ تو جانے پہچانے لوگ تھے، ان کے علاوہ میرٹھ کے بے شمار معصوموں کے بے سبب موت کا پیام آیا۔ دارجلنگ کی جداگانہ ریاست کے قیام کی تحریک نے ۱۹ افراد جانیں لیں۔ پنجاب کے دہشت گرد والے نے سیکڑوں بے گناہوں کو قتل کر دیا۔ عراق، ایران جنگ نے ایک ۵ لاکھ جانوں کا نذرانہ قبول کیا۔ افغانستان کے سیکڑوں مجاہدین شہیدوں کی فہرست میں اپنا نام لکھا گئے۔ پاکستان کی بھی

مہاجرین اور پٹھانوں کی نسلی جنگی نے سینکڑوں جانیں لیں۔ سانحہ مکہ نے ایران کے تقریباً چار سو حاجیوں کی جانیں لیں۔

بمبئی کے فساد میں عید میلاد النبیؐ کے موقع پر ریلائنس کپ کو خونِ مسلم کا نذرانہ پیش کیا گیا۔ "کرکٹ برائے امن" کو خونِ مسلم سے لالہ زار بنا دیا گیا۔ جنوبی افریقہ میں خونی معرکہ آرائی جاری ہے۔ اس خونریز معرکہ آرائی میں ۲۵۰ سے زائد افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں ایتھوپیا خاص طور پر سنگین حالات سے دوچار رہا ہے۔ بارش نہ ہونے کی وجہ سے پانچ لاکھ افراد کے لقمۂ اجل بننے کا خطرہ ہے۔ نیز افریقہ کے ممالک مثلاً نیا، سوڈان وغیرہ میں خانہ جنگی کی وجہ سے قحط کی صورتِ حال اور زیادہ سنگین ہوتی جا رہی ہے۔ مشہور گلوکار BOP نے ایتھوپیا کے قحط زدہ لوگوں کے لئے کثیر رقم جمع کر کے بھجوا دیا ہے۔

قحط زدہ علاقوں کے لوگوں نے اپنے گھروں کو چھوڑ کر دوسری جگہ پناہ بھی شروع کر دی ہے۔
اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ کھیتی پر کام کرنے کیلئے آدمی نظر نہیں آتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگر اس سال زراعت کا کام نہ کیا گیا تو آئندہ سال پھر قحط کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بہرحال ہر سال جو گزرتا ہے اپنی تاریخ چھوڑ جاتا ہے۔

۱۰ نومبر ۱۹۸۷ء کو تیونس کے معمر سیاستدان حبیب بورقیبہ کا دورِ صدارت اچانک ختم ہو گیا۔ جب اُن کے وزیر بن علی نے انھیں اس بنا پر معزول کر دیا کہ وہ اب حکمرانی کے اہل نہیں رہے۔
۱۹۸۷ء کا سال برصغیر ہندوستان اور پاکستان کے لئے مجموعی طور پر خوش آئند نہیں کہا جا سکتا۔ اس سال کا آغاز پاکستان اور ہندوستان کے درمیان محاذ آرائی سے ہوا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی۔ ہندوستان نے ایک فوجی مشق کا اعلان ۱۹۸۶ء کے اواخر ہی میں کر دیا تھا۔ ۱۹۸۷ء کے آغاز ہی میں کوئی ڈھائی لاکھ ہندوستانی فوجیں راجستھان میں اکٹھا کر دی گئیں۔ یہ دیکھ کر پاکستان نے بھی اپنی فوجیں ہندوستان کی سرحد پر لا کر کھڑی کر دیں۔ دونوں نے ایک دوسرے پر اشتعال انگیزی کا الزام لگایا۔ بالآخر یہ مسئلہ خیر و خوبی کے ساتھ نمٹ گیا۔
حقیقت یہ جانتے ہیں کہ یہ ایک سنگین دور تھا۔ دونوں ملکوں کی حکومتیں اپنی اندرونی پالیسیوں میں انتہائی طور پر ناکام رہیں۔ دونوں ملکوں کے عوام اپنی اپنی حکومت سے ناراض اور نالاں رہے۔ عوام کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کے لئے یہ خطرناک ڈرامہ کھیلا گیا۔ ڈھائی لاکھ فوج کو اکٹھا کرنے

اور ایک طویل عرصے تک فوجی مشقیں کرانے میں ملک کا ۵۰۰ کروڑ سے زائد روپیہ خرچ ہوا۔
اُدھر پاکستان کے صدر ضیاء الحق صاحب نے اسی اثنا میں وعدہ کیا کہ وہ کرکٹ میچ دیکھنے جے پور جائیں گے۔ چنانچہ وہ وہاں گئے اور جے پور میں میچ دیکھنے گئے۔ "کرکٹ برائے امن" کی باتیں کی گئیں جبکہ دونوں ملکوں کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرائی کی مشقیں کر رہی تھیں۔

اسی طرح اکتوبر ۱۹۸۷ء میں سیاچین کے قبضے کے سلسلہ میں ہندوستان اور پاکستان کی فوجوں کے درمیان شدید جھڑپیں ہوئیں جن میں ہندوستان کا پلڑا بھاری رہا۔ بالآخر نومبر کے اوائل میں جنوبی ایشیا کے علاقائی تعاون کی تنظیم (SARK) کی سربراہی کانفرنس کٹھمنڈو میں ہوئی۔ پاکستان کے وزیراعظم جونیجو اور ہندوستان کے وزیراعظم مسٹر راجیو گاندھی کے درمیان بات چیت ہوئی۔ طے پایا کہ دونوں ملک چند ہفتوں کے بعد دو طرفہ مذاکرات کا سلسلہ شروع کریں۔

بلاشبہ مسٹر وی۔ پی۔ سنگھ کو "THE MAN OF 1987" کہنا مناسب رہے گا کیونکہ مرکزی حکومت کی وزارت سے علیحدہ ہونے کے بعد انھوں نے ہندوستان کی سیاست میں زبردست طلاطم برپا کر دیا۔ جہاں کہیں بھی V.P. گئے عوام نے ان کا پرجوش استقبال کیا۔ لیکن کاش اگر V.P. بم دو سال بعد پارلیمنٹ کے آئندہ الیکشن سے چند ماہ پہلے چھوڑتا تو کانگریس پارٹی اور راجیو کی حکومت کے پرخچے اڑا دیتا اور بہت ممکن تھا کہ جس طرح جے پرکاش نارائن نے اندرا حکومت کا تختہ ایمرجنسی کے بعد الٹ دیا تھا وی۔ پی۔ بھی راجیو کو دہلی کے تخت سے اتارنے میں کامیاب ہو جاتے۔
المختصر ۱۹۸۷ء ہندوستان اور پاکستان کی معرکہ آرائی، بنگلہ دیش و سری لنکا کی بدامنی، افریقہ کی قحط سالی، ہندوستان میں خونِ مسلم کی ہولی، افغانستان کی طویل جنگ، عراق اور ایران کے درمیان خلیج کی عجیب جنگ، سانحہ مکہ اور افریقہ کی خانہ جنگیوں کے شعلوں کی آگ میں جھلس کر ۳۱ دسمبر کو رات کے ٹھیک ۱۲ بجے ختم ہو گیا ہے۔

الوداع! اے خونی سال الوداع!!

میری نام نہاد اسلام کی زد و ور آواز نے "یادِ ماضی" کو آواز دی اور یہ منتشر خیالات میرے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ میری زبان سے بے ساختہ یہ شعر نکلا ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یارب! ؛ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

باقی صفحہ ۹۳ پر

[illegible]

تحریر: ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا

حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ

عمرو بن جموح کا شمار دورِ جاہلیت میں یثرب کے زعماء میں ہوتا تھا۔ وہ قبیلہ بنو سلمہ کے سردار، عزیز سردار، مدینے کے مشہور صاحبِ جود و سخا اور اربابِ مروت میں سے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں اشراف کی یہ امتیازی شان سمجھی جاتی تھی کہ ان میں سے ہر ایک اپنے لئے خاص طور سے الگ الگ بت اپنے گھر میں رکھتا تھا، تاکہ ہر صبح و شام اس سے برکت حاصل کرے، موسمِ حج میں اس کی خوشنودی حاصل کرنے اور اظہارِ عقیدت کے طور پر اس کے لئے جانور ذبح کرے اور مصیبت اور پریشانی کی کٹھن گھڑیوں میں اس سے امان و پناہ کی درخواست کرے۔ اس وقت کے رواج کے مطابق عمرو بن جموح کے پاس بھی ایک بت تھا جس کا نام "مناۃ" تھا۔ اس کو انہوں نے بہت قیمتی اور نفیس لکڑی سے بنایا تھا۔ عمرو بن جموح اس سے غیر معمولی عقیدت رکھتے، اس کے رکھ رکھاؤ کا بڑا اہتمام کرتے، اس کی دیکھ ریکھ کے لئے برابر فکرمند رہتے اور ہمیشہ اس کو نفیس ترین خوشبو سے معطر کئے رہتے تھے۔

آفتابِ اسلام کی شعاعیں جس وقت مبشرِ اول حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ذریعہ یثرب کے ایک ایک گھر پر ضوفگن ہو رہی تھیں، عمرو بن جموح کی عمر ساٹھ سے متجاوز ہو چکی تھی، اور اس وقت ان کے تینوں بیٹے معاذ، معوذ، خلاد اور ان کے ایک ہم جولی معاذ بن جبل ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ ان تینوں بیٹوں کے ساتھ ان کی ماں ہند بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو چکی تھیں لیکن عمرو بن جموح اس سے بالکل بے خبر تھے۔

عمرو بن جموح کی بیوی نے دیکھا کہ اہلِ یثرب کی بڑی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا ہے اور ان کے شوہر اور معدودے چند لوگوں کے سوا قبائل کے سربرآوردہ سرداروں میں سے کوئی بھی اب شرک پر باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ہند اپنے شوہر سے بہت زیادہ محبت کرتی اور ان کا غیر معمولی احترام

کرتی تھیں اور ان کے متعلق اس بات سے ڈرتی تھیں کہ اگر انہوں نے کفر کو نہیں چھوڑا اور اسی حال میں ان کو موت آگئی تو وہ جہنم کے مستحق قرار پائیں گے۔ ادھر عمرو بن جموح اپنے لڑکوں کے متعلق یہ خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ کہیں یہ لوگ آباء و اجداد کے دین کو چھوڑ کر اس داعیٔ اسلام مصعب بن عمیر کی پیروی نہ اختیار کر لیں جس نے قلیل مدت میں بہت سے لوگوں کو ان کے دین سے پھیر کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل کر لیا ہے۔ اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے بیوی سے کہا۔ "ہند! دیکھو اس بات کا خیال رکھنا کہ جب تک ہم کسی فیصلے پر نہ پہنچ جائیں، تمہارے لڑکے اس شخص سے ملنے نہ پائیں۔"

"میں اس کا خیال رکھوں گی۔" ہند نے کہا۔ "لیکن کیا آپ پسند کریں گے کہ اپنے بیٹے معاذ سے وہ باتیں سن لیں جو وہ اس شخص سے سن کر بیان کر رہا ہے؟"

"تمہارا بھلا ہو، کیا وہ میری لاعلمی میں اپنے دین سے پھر گیا ہے؟" عمرو بن جموح نے پوچھا۔ نیک بیوی کو ان کے اوپر ترس آیا اور انہوں نے جواب دیا۔

"نہیں ایسا نہیں ہے، بلکہ وہ اس داعی کی مجلس میں شامل ہوا تھا اور وہاں اس نے اس کی کچھ باتیں سن لی ہیں۔"

عمرو نے کہا۔ "اس کو میرے پاس بلاؤ۔"

اور جب معاذ ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا کہ "یہ شخص جو کچھ کہتا ہے اس میں سے کچھ باتیں مجھے سناؤ۔" یہ سن کر بیٹے نے باپ کو کلام الٰہی کے یہ دل نشین بول پڑھ کر سنائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین۔ الرحمٰن الرحیم۔ مالک یوم الدین۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ اھدنا الصراط المستقیم۔

شروع کرتا ہوں اس خدا کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ ساری تعریفیں خدا کیلئے ہیں جو تمام عالم کا رب ہے جو رحمٰن و رحیم اور روزِ جزا کا مالک ہے۔ خدایا! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں

صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم و لا الضالین۔

اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں، خدایا! صراط مستقیم کیطرف ہماری رہ نمائی فرما، ان لوگوں کے راستے کی طرف جن پر تو نے انعام فرمایا، جو تیرے غضب کے مستحق ہیں نہ گم کردہ راہ

عمرو بڑے غور و انہماک کے ساتھ اپنے بیٹے کی زبان سے ادا ہونے والے ان دل نشین بولوں کو سنتے رہے پھر انھوں نے سر اٹھایا اور بیٹے سے مخاطب ہوئے: "کتنا خوبصورت اور حسین ہے یہ کلام کیا اس کا سارا کلام ایسا ہی ہے؟"

"اس کا کلام اس سے بھی خوبصورت ہے۔" معاذ نے کہا۔ "ابا جان کیا آپ اس کی بیعت کرنا پسند کریں گے؟ آپ کا پورا قبیلہ اس کی بیعت کر چکا ہے۔"

یہ سن کر بڑے میاں تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ پھر بولے۔

"مناۃ سے مشورہ کئے بغیر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ دیکھتا ہوں وہ مجھے کیا بتائے دیتا ہے۔"

"ابا جان! مناۃ اس سلسلے میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہے، وہ تو لکڑی کا ایک بے جان ٹکڑا ہے، سننے، سمجھنے اور بولنے کی صلاحیت سے محروم۔" نوجوان معاذ نے حقیقت کی نشاندہی کی۔

"میں کہہ چکا ہوں کہ اس سے رائے لئے بغیر میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔" بڑے میاں نے غصے سے تیز ہوتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد عمرو بن جموح وہاں سے اٹھ کر مناۃ کے پاس پہنچے (اہل جاہلیت کا معمول تھا کہ جب وہ کسی بت سے بات کرنا چاہتے تھے تو اس کے پیچھے کسی بوڑھی عورت کو کھڑا کر دیتے اور وہ ان کے زعم باطل کے مطابق جو بات اس بڑھیا کے دل میں ڈالتا وہی کہتی تھی) اور اس کے سامنے اپنے سیدھے اور تندرست پاؤں کے بل کھڑے ہو گئے۔ ان کا ایک لنگڑا تھا — پہلے تو انھوں نے بت کی بھرپور حمد و ثنا کی، پھر بولے۔

"مناۃ! تجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ داعی جو مکے سے ہمارے یہاں پہنچا ہے وہ تیرے علاوہ کسی اور کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ وہ صرف اس لئے یہاں آیا ہے کہ ہم

کو تیری عبادت سے روک دے، اور میں اس کی اچھی باتیں سن چکنے کے باوجود ان کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہوں، جب تک تم سے مشورہ نہ کر لوں تو تم مجھے اس سلسلے میں مناسب مشورہ دو۔"

لیکن جب مناۃ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو عمرو نے کہا کہ "شاید تم ناراض ہو گئے ہو اور میں کوئی ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جو تمہارے لئے باعث اذیت ہو، خیر کوئی بات نہیں، میں تم کو چند روز کی مہلت دیتا ہوں تاکہ تمہارا غصہ فرو ہو جائے۔"

عمرو بن جموح کے لڑکے مناۃ کے ساتھ اپنے باپ کے غیر معمولی تعلق خاطر کو اچھی طرح جانتے تھے، ان کو یہ بات بھی خوب معلوم تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ان کے لئے ایک جزو لازم بن چکا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ ان کے دل میں اس کی عقیدت و نیازمندی کی بنیاد متزلزل ہو رہی ہے، اب یہ ان کا کام ہے کہ اس کی عقیدت کو ان کے دل سے پورے طور پر نکال دیں، ان کو ایمان کی طرف لانے کی یہی ایک شکل تھی۔

عمرو بن جموح کے لڑکے رات کی تاریکی میں اپنے دوست معاذ بن جبل کے ساتھ مناۃ کے پاس پہنچے اور اس کو اس کی جگہ سے اٹھا کر بنو سلمہ کے اس گڑھے پر لے گئے جس میں وہ کوڑا کرکٹ اور گندگی ڈالتے تھے۔ لڑکے اس گڑھے میں پھینک کر گھر لوٹ آئے۔ اور اس کی کارروائی کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ صبح کو جب عمرو اپنے بت کے پاس پہونچے اظہار عقیدت کے لئے پہونچے تو اسے اپنی جگہ سے غائب پایا، یہ دیکھ کر انھوں نے گھر والوں سے کہا کہ — "تم لوگوں کا برا ہو، آج رات میرے معبود کے ساتھ کس نے زیادتی کی ہے؟" لیکن کسی نے ان کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا، وہ گھر کے اندر اور باہر اس کو تلاش کرتے پھرے، وہ شدت غضب میں چیخ چیخ کر گھر والوں کو دھمکی دیتے رہے، اور آخر کار تلاش کرنے کے بعد وہ ان کو گڑھے میں منہ کے بل اوندھا پڑا ہوا مل گیا، انھوں نے اسے وہاں سے نکالا، اسے دھو کر صاف کیا اور خوشبو لگا کر دوبارہ اس کی جگہ پر رکھتے ہوئے بولے۔

"خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ تمہارے ساتھ کس نے یہ حرکت کی ہے تو میں اسے

سخت سزا دوں گا۔"

دوسری رات بھی لڑکوں نے مناۃ کے ساتھ وہی حرکت کی جو پچھلی رات کر چکے تھے۔ صبح کو جب بڑے میاں نے اسے تلاش کیا تو اسی گڑھے میں گندگی میں لوٹ پوٹ پایا۔ آج بھی انھوں نے اس کو وہاں سے نکال کر دھویا اور خوشبو لگا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

لڑکے برابر اس کے ساتھ یہی سلوک کرتے رہے، یہاں تک کہ جب عمرو بن جموح اس حرکت سے بالکل تنگ آگئے تو ایک رات سونے سے پہلے اس کے پاس گئے اور ایک تلوار اس کی گردن میں لٹکاتے ہوئے بولے۔

"اے مناۃ! خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ تیرے ساتھ یہ حرکت کون کرتا ہے۔ اگر تیرے اندر ذرا بھی خیر ہو تو اپنا دفاع کر، یہ تلوار تیرے پاس ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی خوابگاہ میں چلے گئے۔ اور جب لڑکوں کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ بڑے میاں گہری نیند میں پہنچ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکے ہیں تو وہ جھٹ پٹ بت کے پاس پہونچے، انھوں نے اس کی گردن میں پڑی ہوئی تلوار نکال لی اور اس کو گھر کے باہر لے گئے۔ اب کی بار انھوں نے ایک مردہ کتے کو اس کے ساتھ باندھ دیا اور دونوں کو بنو سلمہ کے اسی گڑھے میں پھینک دیا جس میں گندگی اور غلاظت بھری ہوئی تھی۔ صبح کو جب بڑے میاں سو کر اٹھے اور بت کو اپنی جگہ موجود نہیں پایا تو اس کی تلاش میں نکلے، اور حسب معمول اس کو اسی گڑھے میں منہ کے بل پڑا ہوا پایا کہ اس کے ساتھ ایک مردہ کتا بندھا ہوا تھا اور تلوار اس سے چھین لی گئی تھی۔ اب کی بار انھوں نے اس کو گڑھے سے نہیں نکالا بلکہ جہاں لڑکوں نے اسے پھینک دیا تھا وہیں چھوڑ دیا اور بولے۔

واللہ لو کنت الٰہا لم تکن
انت و کلب وسط بئر فی
قرن

"خدا کی قسم اگر تو واقعی معبود ہوتا تو تو کتے کے ساتھ بندھا ہوا گڑھے میں نہ پڑا ہوتا۔"

پھر اس کے بعد انھیں خدا کے دین میں داخل ہوتے دیر نہ لگی۔

جب حضرت عمرو بن جموح نے حلاوت ایمان کا مزہ چکھ لیا تو اپنی عمر کے اس ایک ایک

لمحے پر پشیمانی اور ندامت کا اظہار کرنے لگے جو شرک کی حالت میں گزرا تھا۔ ایمان لانے کے بعد وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ نئے دین کی طرف متوجہ ہو گئے، اور اپنے نفس، اپنے مال اور اپنی اولاد کو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے لئے وقف کر دیا۔

حضرت عمرو بن جموح کے مشرف بہ اسلام ہونے کے کچھ عرصے کے بعد احد کا معرکہ پیش آیا۔ انھوں نے اپنے تینوں بیٹوں کو دشمنان خدا سے مقابلہ کی تیاریاں کرتے ہوئے دیکھا، وہ انھیں صبح و شام بپھرے ہوئے شیروں کی طرح آتے جاتے دیکھتے، ان کے چہرے دولت شہادت اور رضائے الٰہی کے حصول کے شوق میں جگمگا رہے تھے، اس صورت حال نے ان کے اندر بھی جوش و حمیت کو برانگیختہ کر دیا اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر قیادت اپنے بیٹوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے کا تہیہ کر لیا۔ لیکن ان کے لڑکے ان کو اس ارادے سے باز رکھنے پر متفق الرائے ہو گئے کیونکہ وہ ایک سن رسیدہ بوڑھے تھے، اس کے علاوہ ان کے پاؤں میں شدید لنگ تھا اور اسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے انہیں شرکت جہاد سے معذور قرار دیا تھا۔ ان کے بیٹوں نے ان سے کہا کہ "ابا جان! اللہ تعالیٰ نے آپ کو معذور قرار دیا ہے۔" آپ خود کو ایسی بات کا مکلف کیوں قرار دے رہے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف کر دیا ہے" حضرت عمروؓ ان کی اس بات سے سخت ناراض ہوئے اور ان کی شکایت کرنے کے لئے بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور آپ سے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول! میرے یہ بیٹے مجھے اس خیر سے باز رکھنا چاہتے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ میں لنگڑا ہوں اور معذور ہونے کی وجہ سے جہاد میں شریک ہونا میرے لئے ضروری نہیں ہے۔ خدا کی قسم مجھے امید ہے کہ میں اپنی اس لنگ سے جنت میں داخل ہوں گا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یہ ذوق و شوق دیکھا تو ان کے لڑکوں سے فرمایا کہ "ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، ممکن ہے اللہ تعالیٰ ان کو شہادت عطا فرمائے۔" چنانچہ لڑکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق خاموش ہو گئے۔

جب مجاہدین کی روانگی کا وقت آیا تو حضرت عمرو بن جموح ؓ اپنی اہلیہ سے ملے اور ان سے اس طرح رخصت ہوئے، جیسے انہیں لوٹ کر واپس نہیں آنا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے قبلہ رو ہو کر اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیئے اور دعا کی۔

"اللھم ارزقنی الشہادۃ ولا تردنی الی اھلی خایباً" — "خدایا! مجھے شہادت کی دولت نصیب فرما۔ خدایا! مجھے ناکام و نامراد اور شہادت سے محروم کر کے واپس نہ لوٹا۔"

پھر وہ اس شان سے میدان جہاد کی طرف روانہ ہوئے کہ ان کے تینوں اور ان کے قبیلہ بنو سلمہ کی ایک کثیر تعداد نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا اور جب معرکہ کارزار گرم ہوا اور مسلمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر منتشر ہو گئے تو یہ عجیب منظر دیکھنے میں آیا کہ حضرت عمرو بن جموح اپنی تندرست ٹانگ سے کودتے ہوئے مسلمانوں کی اس اگلی جماعت میں شامل ہو گئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے آگے بڑھی تھی۔ اور اس وقت تمنائے شہادت لفظوں کی شکل میں ان کے لبوں پر مچل رہی تھی۔

"انی لمشتاق الی الجنۃ۔ انی لمشتاق الی الجنۃ" "میں جنت کا مشتاق ہوں میں جنت کا مشتاق ہوں"

اس وقت ان کے ایک صاحبزادے حضرت خلاد رضی اللہ عنہ عقب سے ان کی حفاظت کر رہے تھے۔ وہ دونوں باپ بیٹے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے ہوئے مشرکین سے برابر لڑتے رہے، یہاں تک کہ دونوں میدان جنگ میں شہید ہو کر گر پڑے۔ اور دونوں کی شہادت کے درمیان چند لمحات سے زیادہ کا وقفہ حائل نہ تھا۔

جب جنگ ختم ہو گئی تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم شہدائے احد کی تجہیز و تکفین کے لئے کھڑے ہوئے اور صحابہ کرام سے فرمایا کہ "انھیں ان کے خون اور زخموں سمیت ہی دفن کر دو، میں ان کا گواہ ہوں۔" پھر آپ نے فرمایا "جو مسلمان راہ خدا میں زخمی ہوگا، وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ زخموں سے اس کا خون جاری ہوگا، اس خون کا رنگ زعفرانی

باقی صفحہ پر

صباح الدین فلاحی

ابوالاعلیٰ کا نثری سرمایہ

ابتدائیہ

اصولی طور پر زندگی کے مسائل میں ایک مسلمان کی نظر اس سرچشمۂ ہدایت کی طرف جاتی ہے اور جانی چاہئے جس کا منبع خود خالق کائنات کی ذات ہے۔ دنیا کے معاملات میں مسلمان کا موقف یہ ہے کہ وہ ہر طرح کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کتاب الٰہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ایک مسلمان کے نزدیک بھلائی اور برائی، خیر و شر اور حسن و قبح کا پیمانہ دنیا، انسانی عقل یا دنیا کے نام نہاد مفکرین نہیں ہیں بلکہ خدائے علیم و حکیم اور اس کا رسول ہے۔ اس کے نزدیک حق وہ ہے جو خدا اور اس کا رسول بتاتا ہے۔ اور اس کے علاوہ ہر شے باطل، ہر چیز ناحق، ہر معیار ناقص اور ہر پیمانہ ناقابل اعتبار ہے۔

اگر زندگی ایک کل ہے اور اس کا کوئی گوشہ اس کل سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور دین اسلام انسان کی پوری زندگی کا رہنما ہے تو یہ ممکن نہیں کہ زبان و بیان، شعر و ادب کے گوشے اس کی رہنمائی سے الگ رہ سکیں۔ اگر اسلام نے مذہب و اخلاق، سیاست و معیشت، تمدن و معاشرت، غرض زندگی کے ہر شعبہ کو ایک پیمانہ حق و باطل اور معیار خیر و شر دیا ہے تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے صرف علم و ادب اور فکر و فن ہی کو اس سے محروم رکھا۔ کیا یہ سوچنا معقول ہوگا کہ اس نے قلم سے لکھنا اور زبان سے بولنا سکھایا خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (رحمٰن ۳-۴) الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (علق ۔ ۴) مگر زبان و قلم کو حسن و قبح کا کوئی معیار نہیں عطا کیا؟

اب ظاہر ہے کہ معقولیت یہی کہتی ہے کہ زبان و ادب کے معاملہ میں اسلام نے یقیناً کوئی مستقل اور اٹل پیمانہ دیا ہوگا جس پر بدلتے ہوئے حالات اور زمانے کے تغیرات کا کوئی اثر نہ ہو جو بات خود حق ہو اور وہ دنیا کے انسانوں کی تائید کا محتاج نہ ہو۔

آیئے اس پر غور کریں کہ دین و شریعت کے سرچشمہ میں ادب کا وہ بلند معیار جامع اور حسین ترین ادب کا وہ معیار کیا ہے؟

یہ تلاش و جستجو ہمیں قرآن کی اس پُر حکمت آیت تک پہنچاتی ہے: ومن احسن قولاً ممن دعا الی اللہ و عمل صالحاً و قال اننی من المسلمین۔ (فصلت ۳۳) اس آیت میں احسن قولاً کے الفاظ لائق غور ہیں۔ بہترین کلام اور عظیم ادب کی اگر کوئی امتیازی خصوصیت ہو سکتی ہے تو وہ یہی کہ ادب اس سب سے بڑی حقیقت کا ترجمان ہو کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے۔ وہی اس دنیا کا حاکم، منتظم اور مدبر ہے۔ یہ آیت ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ ادیب کی شخصیت اور اس کی سیرت کو اس بڑی حقیقت کا تابع ہونا چاہیے۔ ادب اور ادیب کی یہی خصوصیات ہیں جو کسی ادیب کے ادب کو عظمت، عالمگیریت اور بقا و دوام عطا کرتی ہیں۔ حق پرستی، بلند نظری اور راست فکری کی یہی خصوصیت ادیب کو مختلف زبانوں کے حدود و دائروں سے نکال کر عظیم اور عالمگیر ادیب بنا دیتی ہے۔

اس آیت کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خدائے تعالے اور انبیاء و رسل نیز داعیانِ حق ہی سب سے بڑے ادیب ہیں۔ قرآن کا یہ دعویٰ بظاہر انوکھا اور عجیب معلوم ہوتا ہے۔ کیا عقل و نقل، روایت و درایت اور تاریخ انسانی خصوصاً تاریخ انبیاء و رسل اس دعویٰ کی صداقت کی گواہی دیتے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے تو آپ محسوس کریں گے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی عقل و فہم اس کی تصدیق کرتی ہے۔ عقل کیا کہتی ہے۔ آیا حق و صداقت میں حسن ہے یا کذب و باطل اور جہالت میں۔ جمال راستی، انصاف اور دیانت میں ہے یا کج فکری، ظلم اور بددیانتی میں۔ عقل کیا جواب دیتی ہے۔ زبان و بیان وہ حسین ہے جو انسانیت، شرافت، انصاف اور حقانیت کا علمبردار ہو یا جو حیوانیت، بدتہذیبی، ظلم و جور، اور جہالت کا پرچار کرے۔ ادب وہ ہے جو احترام آدمیت، تہذیب، شائستگی اور ادب سکھائے یا وہ جو برخلاف ان اوصاف کو پروان چڑھائے جو بے دینی پھیلائے، غلط اور بیہودہ قسم کے خیالات کو رواج دے، بے بنیاد اور جاہلی نظریات کی تبلیغ کرے۔ ظاہر ہے عقل کا فیصلہ صالح افکار کے حامل ادب ہی کے حق میں ہے۔

تاریخ کا مطالعہ بھی ہمیں اسی نتیجے تک پہنچاتا ہے۔ خدا کی طرف سے انسانوں کی ہدایت کے لئے جتنی کتابیں آئیں وہ اپنی زبانوں میں معجز ادب پیش کرتی ہیں اور ہر دور کے مخاطبین نے اسی اعجاز کی بنا پر ایمان لانے کا اہتمام کیا۔ دوسری آسمانی کتابیں تو روئے زمین پر موجود نہیں لیکن قرآن اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ عرب ادباء کو اپنی زباندانی اور فصاحت و بلاغت پر جو ناز تھا وہ آپ کو معلوم ہے لیکن کیا قرآن کے بار بار کے چیلنج کے باوجود کوئی بڑے سے بڑا ادیب اس کے مقابلے کی کوئی سی

عبارت بھی لا سکا۔ ام یقولون افتراہ قل فاتوا بسورۃ مثلہ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین۔ (یونس ۳۸)۔ قرآن نے خود اپنی زبان کو عربی مبین کہا ہے اور کسی بڑے سے بڑے ادیب کو اس کے جھٹلانے کی جرأت نہ ہو سکی۔ یہاں پر قرآن سے اس کی ادبیت کی کوئی مثال پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو عربی ادب سے واقف ہو اس کے لئے پورا قرآن ادب کا شاہکار ہے۔ اس نے زندگی کے ہر مسئلہ پر بنیادی بحث کی ہے۔ دیکھئے کہ وہاں اس نے کیا طرز ادا اختیار کیا ہے جو اردو داں عربی سے واقف نہیں وہ تفہیم، تدبر، ترجمان (مولانا آزاد) کے مقدموں کو پڑھ کر قرآن کی ادبیت سے واقف ہو سکتے ہیں۔

آسمانی کتابوں کے بعد انبیاء کو لیجئے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ انبیاء سب سے بڑے ادیب ہیں۔ انبیاء کو جو منصب اور فریضہ ہے اس کے لئے لازمی تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں زبان و بیان کی تمام خوبیوں سے متصف کرتا۔ تعلیم، تزکیہ اور بلاغ و رسالت متقاضی تھی کہ انہیں انتہائی مؤثر، دلکش اور معجزنما زبان عطا کی جائے۔ اس پر تو عقل بھی گواہی دیتی ہے۔ انبیاء کی سوانح بھی اس کے لئے ناقابل تردید ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ قرآن نے متعدد انبیاء کے بارے میں صراحت کی ہے کہ انہیں زبان و بیان کی مہارت عطا کی گئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا یوں مذکور ہے: رب اشرح لی صدری ویسر لی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقہوا قولی۔ (طٰہٰ ۲۵-۲۸)

حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے کہ: واتیناہ الحکمۃ وفصل الخطاب (صٓ ۲۰) اس کے علاوہ بعض انبیاء کی دعائیں، ان کے اقوال، ان کی دعوت اور ان کا استدلال نقل ہوا ہے مثلاً حضرت ابراہیمؑ کا آزر اور نمرود سے مکالمہ، حضرت موسیٰؑ کا خود اللہ تعالے سے مکالمہ اور موسیٰؑ و فرعون کا مکالمہ وغیرہ۔ قرآن کی ان آیات سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ انبیاء کو زبان و بیان پر خصوصی مہارت اور قدرت حاصل رہی ہے۔ ان تمام انبیاء کے اقوال بالفاظہا ہمارے پاس موجود نہیں ہیں لیکن نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعض خطبے، بعض مکتوبات، دعائیں اور بے شمار اقوال بالفاظہا موجود ہیں جنہیں دیکھ کر اور جانچ پرکھ کر ہم قرآن کے دعویٰ کا ثبوت پا سکتے ہیں۔ یہ آپ کے کلام کا اعجاز ہی تو ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ اسلام کے دستور و قانون کی تشکیل کرتا ہے۔ پھر ہمارے سامنے جاہلی دور اور اسلامی ادوار کے عربی کلام موجود ہیں۔ ہم نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان سے موازنہ کرکے بآسانی اس

تعبیر پہنچے ہیں کہ جس نے ادب کے کلام اس کے پایہ کو نہیں پہنچا۔ ہم یہاں آپ کے کلام کی مثالیں نہیں پیش کرتے، نہ اس کی اس مختصر مقالے میں گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔ یہ بات خود دشمنوں کو مسلم ہے اور ایسا کسی عقیدت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ یہ اتنا واضح ہے کہ اس کے لئے کسی واقف زبان کو نمونہ دکھانے کی ضرورت نہیں۔ دن کے وقت دن ثابت کرنے کے لئے کسی کو سورج دکھانا دراصل سورج دکھانے والے کی حماقت کا ثبوت ہوا کرتا ہے۔

قرآن کا دعوے عام و خاص تمام داعیان حق کے متعلق ہے۔ ہم نے دعوت الی اللہ کے دو اصلی سرچشموں، کتاب و سنت کا جائزہ لے کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ زبان و ادب کے معراج کمال ہی نہیں بلکہ معجزہ مرتبہ کو پہنچی ہوئی ہیں۔ کتاب و سنت کے بعد عام داعیان حق کی زبان و بیان پر تحقیق کی نظر ڈالئے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جو ادب داعیان حق کے منظم گروہ نے پیدا کیا اس کے مقابل میں دنیا کے بڑے سے بڑے جاہلی ادبا کا ادب بے ظاہری خوشنمائی کے علاوہ کوئی تاثیر، کوئی دلکشی، کوئی زور اور کوئی مقبولیت نہیں رکھتا۔ حضرت ابوبکر و عمر اور علی رضی اللہ عنہم کے جو خطبے ہم تک پہنچے ہیں انہیں دیکھ کر اس دعوے کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ بعد کے زمانوں میں امام شافعی، امام ابن تیمیہ، شیخ احمد سرہندی، محمد بن عبدالوہاب، شاہ ولی اللہ، شکیب ارسلان، حسن البنا شہید اور سید قطب شہید اور ان جیسے دوسرے مشاہیر داعیان حق نے جو تصنیفات چھوڑی ہیں وہ دنیائے ادب میں بلند ترین اور حسین ترین کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔ اقبال اور مودودی رحمۃ اللہ کا ادب بھی اسی زمرے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس حقیقی ادب کے بالمقابل جاہلی ادب کی مقدار کثیر رہی ہے اور اس نے دنیا کی بڑی بڑی دنیا پر اپنا تسلط قائم کیا ہے لیکن حقائق کی نظر میں وہ بے وزن ٹھہرا ہے۔ انسانیت نے زندگی کے سفر میں جب بھی اس کی طرف رجوع کیا ٹھوکر کھائی ہے۔ اس نے انسانیت کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ حقیقت کو سب سے بڑا پردہ بن گیا۔ ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کو چھوڑیئے ہم ان جاہلی ادبا کی بات کرتے ہیں جنھوں نے علم کے نام پر جہالت کو فروغ دیا جنھوں نے وہم و گمان کو حقیقت کہہ کر پیش کیا اور جنھوں نے اپنے بے بنیاد قیاسات و اوہام کو اصول اور نظریہ کا نام دے ڈالا۔ ان کی تحریر پڑھ کر ایک عالم ہر زمانہ میں ان کی ضلالت و گمراہی کا شکار رہا۔

افلاطون، ارسطو، دانتے، ملٹن اور جان اسٹورٹ مل، کارل مارکس اور فریڈرک انجلز،

روسو، والٹیر اور شیکسپیئر، سکاٹ، والٹ، ڈی ایچ لارنس، جارج برنارڈ شا اور ٹی ایس ایلیٹ، برٹرینڈ رسل اور نطشے، چرچل وغیرہ، یہ بیسیوں بلکہ بے شمار نام نہاد ادبا اصل ضلالت و گمراہی کے پیشوا اور امام ہیں انھیں ہم ادیب کہہ کر ادب کے وقار اور نام کو رسوا نہیں کرنا چاہتے۔ ان ادیبوں کے لئے ہمارے پاس سب سے اچھا الفاظ "الادبیت" کا ہی لقب ہے۔

ادب کی تعریف

ہمارے نزدیک ادب مرکب ہے حسن فکر اور حسن بیان سے۔ تاہم ان دونوں کا مرتبہ یکساں ہے۔ ادب کی روح حسن فکر اور حسن بیان قالب۔ ادب میں حسن فکر ایسے ہے جیسے جسم انسانی میں اس کی روح اور حسن بیان کا اس میں وہی مقام ہے جو گوشت پوست سے بنے ہوئے ایک خوبصورت ڈھانچے کا انسانی جسم میں حاصل ہے۔ ایک بلند و توانا ادب کا جوہر اور خمیر انہی دو چیزوں یعنی فکر محض اور بیان محض کا مخلوط ایک اندھا اور لنگڑا ادب ہوگا جس سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایسے ادب کو نہ تو اسلام ادب مانتا ہے اور نہ جاہلیت۔ ادب کے معاملے میں اسلام اور جاہلیت کے مابین یہیں تک لفظی اتحاد ہے اس کے آگے دونوں میں اختلاف شروع ہوتا ہے۔ اسلام کے نزدیک فکر محض اور حسن بیان کے امتزاج سے جو ادب تشکیل پاتا ہے وہ ادب نہیں بے ادبی ہے یا پھر اسے تخریبی گمراہ کن ادب کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ ادب دراصل اندھا ہوتا ہے اور اندھا ہوتے ہوئے انسانوں کی رہنمائی کا دعویٰ لے کر اٹھتا ہے اس لئے یہ بڑا خطرناک ادب ہوتا ہے۔ جاہلی ادبا اسی معیار ادب کے حامل ہیں۔ سچی جاہلی ادب یہی ہے۔ اس کے برخلاف دو قسم کے ادب ہیں، ایک وہ جو حسن فکر اور حسن بیان سے عبارت ہے یہ اسلام کا معیاری ادب ہے اور قرآن کا بہترین نمونہ، دوسرے وہ جو حسن فکر اور بیان محض کے توام سے صورت پذیر ہوتا ہے۔ اسلام اسے ادب کا دوسرا درجہ دیتا ہے۔

اسلام اور جاہلیت کے معیار ادب و بے ادبی میں جو فرق ہے وہ یہ کہ اسلام فکر اور بیان کو دونوں کو ان کا مقام دیتا ہے لیکن جاہلیت مطلق حسن بیان کی شیدائی اور عاشق ہے۔ جاہلیت اپنے مقصد کے لئے حسینہ کو پسند کرتی ہے اور اس سے کام لے کر وہ بے وفا ہے یا باوفا۔ برخلاف اس کے اسلام بھی رفاقت کے لئے ایک حسینہ کا خواہشمند ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ وہ باعصمت اور وفا شعار ہو۔ اس کے نزدیک ایک عام باوفا اور عفیف دوشیزہ، ایک بد چلن حسینہ سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

ولعبد مؤمن خیر من مشرک ولو اعجبکم اولئک یدعون الی النار واللہ یدعوا

الی الجنة والمغفرة باذنه (بقرہ ۲۲۱)

اسلام ایک کمزور مومن کو کسی تندرست (قوی) کافر کے مقابلے میں کہیں زیادہ معتبر قرار دیتا ہے اور کافر توانا کا فر کو لکڑی کے بے جان کندے سے تشبیہ دیتا ہے:

واذا رأیتهم تعجبك اجسامهم وان یقولوا تسمع لقولهم کأنهم خشب مسندة۔ (المنافقون: ۴)۔

پھر اسلام اپنے کمزور اور عاجز پیرؤوں میں طاقتور کو زیادہ بہتر قرار دیتا ہے کیونکہ یہی عقل و فطرت کا تقاضا ہے: المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف۔ (حدیث)

انسان کے ادب میں اسلام کا یہی تصور بے کم و کاست ان دونوں ادب پر بھی راست آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ محمد صلی اللہ کو سب سے بڑا ادیب قرار دیتا ہے۔ ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ۔ زبان و بیان کے معاملے میں قرآن نے ایک داعی کو متعدد جگہ اس طرح کی تاکید بھی کی ہے:

ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن (النحل ۱۲۵)

جس کا نتیجہ ہے کہ داعیانِ حق ہمیشہ دنیائے ادب کو حسن و زینت بخشتے رہے ہیں۔

گزشتہ چودہ صدیوں میں اسلام عربی زبان کے دائرے سے نکل کر مختلف دوسری زبانوں میں بھی پھیلتا رہا۔ متعدد قومیں اپنی زبانوں کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئیں۔ قریب قریب ان تمام زبانوں میں ایسے داعیِ حق پیدا ہوئے جنھوں نے دعوتِ حق کا فریضہ اپنی زبانوں میں حسن و خوبی انجام دیا اور اس کے نتیجے میں مختلف زبانوں میں اسلام کا معیاری ادب وجود میں آیا۔ بجا طور پر یہ تمام ادبا اعلیٰ ادب کی صفِ اوّل میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ جو زبانیں اسلام کے فروغ کا ذریعہ بنیں، وہ جنھیں داعیانِ حق نے اسلام کی تبلیغ و دعوت کے لیے چنا ان میں اردو کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس زبان میں بہت سے داعی الی اللہ پیدا ہوئے اور اردو کو بھی معیاری ادب سے مالامال کیا۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ دکن کے داعیوں اور ادیبوں کے حسن بیان کا ذریعہ تھا۔ اردو کے تمام ادبا کی فہرست تو بڑی لمبی ہے جن کا ذکر طوالت سے خالی نہیں۔ ہم یہاں صرف چند ادیبوں کی فہرست دے رہے ہیں جنھوں نے ادب اردو کے ارتقا میں نمایاں اور اہم رول ادا کیا ہے اور جنھیں فکری اور ادب کا سلسلۃ الذہب قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس فہرست کے علاوہ کم از کم اہم ادبا نہیں ہیں۔ جن صاحب نظر ادبا میں نظر ڈالنے کے لیے کم ہمیں بھی نظر آیا ہے انھیں ہم نے

باقی صفحہ پر

تعارف و تبصرہ

ولی اللہ سعیدی فلاحی

موضوع اور ضعیف حدیثوں کا چلن

از: شمس پیرزادہ
ناشر: ادارہ دعوۃ القرآن ۵۰ محمد علی روڈ بمبئی ۳
قیمت: ۵۰/۱

جناب مولانا شمس پیرزادہ صاحب کی شخصیت علمی طبقے میں محتاجِ تعارف نہیں۔ جنوری ۱۹۸۸ء کے شمارے میں استاذ محترم جناب مولانا حافظ نعیم الدین اصلاحی صاحب نے آپ کی شخصیت کے بارے میں ایک جامع تعارف پیش کیا ہے۔ اس کے بعد مزید کچھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

استاذ محترم نے لکھا ہے کہ "ادھر چند سالوں سے موصوف قرآن پاک کے ترجمہ و تفسیر کا کام "دعوۃ القرآن" کے نام سے بڑی ہی خاموشی، لگن اور تسلسل کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔" اس کے ساتھ ساتھ موصوف دوسرے موضوعات پر بھی وقتاً فوقتاً وقت کے تقاضے کے ساتھ لکھتے رہتے ہیں۔ کبھی مستقل کسی مقالے کی شکل میں اور کبھی کسی مستفسر کے جواب میں۔

زیرِ نظر کتابچہ بھی ایک مستفسر کے جواب میں لکھا گیا ایک مقالہ ہے جو ماہنامہ "نشاۃ ثانیہ" بمبئی کے دسمبر ۱۹۸۶ء اور مارچ ۱۹۸۷ء کے شماروں میں شائع ہو چکا ہے۔

کفر و اسلام میں کشمکش ہر وقت رہی ہے اور تا قیامت رہے گی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے رحلت فرما جانے کے کچھ ہی دنوں بعد ہی سے چند اسلام دشمن عناصر نے وضعِ حدیث جیسا ناپاک کام شروع کر دیا تاکہ اسلامی تعلیمات کو مسخ کر سکیں۔ وہ اپنے اس مقصد میں ایک حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ آج کتنے ایسے لوگ ہیں جنھوں نے انھی موضوع احادیث کو بنیاد کی حیثیت دے دی اور کتنے ہی ایسے واعظ اور ناصح ہیں جو برملا اپنی تقریروں اور تحریروں میں ان احادیث کا ذکر کرتے ہیں مزید برآں غیروں کی طرح اپنوں نے بھی اس دنیا کو [illegible] کیا حتیٰ کہ عمر بھر کی تمام عبادت کے صلے میں ملنے والی جنت کو صرف درود کے چند جملوں کے ذریعہ عوام کو دلانے کا وعدہ کر کے انھیں خوابِ غفلت میں سُلا دیا۔

مولف موصوف کا یہ کتابچہ اگرچہ مختصر ہے پھر بھی افادیت کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہے۔ موصوف نے مشہور عام ضعیف اور موضوع روایت کو ذکر کیا ہے، مثالیں دی ہیں اور آخر میں ان کا موقف راویوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

موصوف محترم نے پمفلٹ کے آخر میں ایک سرخی "موضوع اور ضعیف حدیثوں پر کتابیں" قائم کی ہے، اور اس میں موضوع احادیث کے متعلق چند کتابوں کا نام درج کیا ہے۔ راقم الحروف افادۂ عام کی خاطر چند کتابیں مزید ذکر کرتا ہے وہ یہ ہیں:

۱: العلل المتناهية في الأحاديث الواهية
عبد الرحمن بن علی بن الجوزی التیمی رحمۃ اللہ علیہ (۵۱۰ — ۵۹۷ ھ)
دار الکتب بیروت، لبنان

۲: المصنوع في معرفة الحديث الموضوع۔ وهو الموضوعات الصغرى
علی القاری الہروی المکی (توفی بمکۃ المکرمۃ ۱۰۱۴ھ)
مکتب المطبوعات الاسلامیہ بیروت

۳: المنار المنيف في الصحيح والضعيف
ابو عبد اللہ محمد بن ابی بکر المعروف بابن قیم الجوزیۃ (۶۹۱ — ۷۵۱ ھ)
مکتب المطبوعات الاسلامیہ

موضوع احادیث پر کتابوں کے ضمن میں موصوف نے مصنف کے ساتھ ان کے سن وفات کا بھی تذکرہ کیا ہے لیکن تمییز الطیب من الخبیث میں صرف مصنف کا نام شیبانی ذکر کیا، اور نہ سن پیدائش لکھا نہ سن وفات۔ شیبانیؒ کا پورا نام عبد الرحمن بن علی بن محمد الشیبانی الزبیدی الشافعی ہے۔ آپ ابن الدیبع سے مشہور ہیں اور آپ کا سن پیدائش و وفات (۸۶۶ — ۹۴۴ھ، ۱۴۶۱ — ۱۵۳۷ء) ہے۔

یہ پمفلٹ نہایت جامع اور مفید ہے۔ ہر گھر میں ایک عدد موجود ہونا چاہئے۔ اہل خیر حضرات اگر اس پمفلٹ کو چھپوا کر مفت تقسیم کریں تو نیکی کا ایک کام ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

x x x x

ہفت روزہ "ظہور اسلام" سری نگر

مدیر: محمد ناصر — مدیر اعزازی: ابو البیان حماد

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ، پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۳۰۸، سری نگر ۱

"ظہور اسلام" سری نگر سے نکلنے والا ایک ہفت روزہ اخبار ہے جو وادی کشمیر میں جہاد و قلم کا فریضہ انجام دے رہا ہے، اور تقریباً تیس سال سے اسلام کی نشر و اشاعت میں کافی حد تک کامیابی حاصل کر چکا ہے۔

ظہور اسلام میں درس قرآن، انتخاب حدیث کے ساتھ ساتھ ملت کو حالات حاضرہ سے باخبر کرنے کے لئے حالات کی مناسبت سے اہم مضامین بھی شامل ہوتے ہیں۔ تاریخ و سیرت اور طب جیسے فنون پر بھی مقالات اور مضامین شائع ہوتے ہیں۔ نیز اشعار و نظمیں اس کے حسن کو مزید دوبالا کر دیتے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے یہ اخبار نہایت عمدہ اور فائدہ مند ہے۔ یہ آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ قیمت بھی نہایت مناسب ہے۔ ایسے اخبارات ہندوستان میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ پورا اخبار اول تا آخر بہترین مواد سے پر ہوتا ہے۔ ہر خاص و عام کے استفادے کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے مزید ترقی دے۔ آمین۔

بقیہ: ابو الاعلیٰؒ کا آخری سرمایہ:

ان کو جا کر مقام دیا ہے، اس سنہری فہرست پر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کی ہر کڑی ارتقاء حسن کی ایک درجہ سے مربوط اور حسن بیان کے معاملہ میں اپنی جگہ منفرد خصوصیات کی حامل ہے۔

اُردو ادب کا سلسلۃ الذہب: ہمارے نزدیک ان چند دل افروز شہ پاروں کی تعداد سات ہے۔

۱: شاہ اسمٰعیل شہیدؒ	۱۷۷۹ء	۲: سرسید احمد خاں	۱۸۱۷ء
۳: الطاف حسین حالیؔ	۱۸۳۷ء	۴: علامہ شبلی نعمانیؒ	۱۸۵۷ء

۵: علامہ محمد اقبالؒ ۱۸۷۷ء، ۶: مولانا ابو الکلام آزاد ۱۸۸۸ء، ۷: سید ابو الاعلیٰ مودودی ۱۹۰۳ء

جاری

ولی اللہ مجید قادری

جامعہ کے لیل و نہار

جناب ماسٹر عبدالمالک صاحب کو الوداعی پارٹی

استاذ محترم جناب ماسٹر عبدالمالک صاحب کا [illegible] جامعہ کو الوداع کہہ گئے

کا فیصلہ ہر طالب علم کے لئے ایک تکلیف دہ خبر تھی۔ ایک مشفق استاذ اور ان کے شاگردوں کی محبت و شفقت ختم ہونے والی تھی۔ اس فیصلہ پر ایک طرف جہاں طلبہ کافی رنجیدہ نظر آتے ہیں، دوسری طرف استاذ محترم بھی کافی غمگین نظر آ رہے تھے۔ لیکن مجبوریاں راستہ روکے کھڑی تھیں۔

استاذ محترم کو جامعہ کی طرف سے ۱۰ دسمبر ۱۹۹۷ء کو پارٹی دی گئی۔ سب سے پہلے صدر جامعہ جناب مولانا عبد الحسیب اعظمی صاحب نے اساتذہ کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنی گفتگو کا آغاز ان الفاظ میں کیا: محترم ساتھیو! آج کی یہ نشست جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، محترم ماسٹر عبدالمالک صاحب کو رخصت کرنے کے لئے منعقد کی گئی ہے۔ ماسٹر صاحب ادھر ایک عرصۂ دراز سے ہمارے درمیان تھے۔ ایک کامیاب استاذ کی حیثیت سے با صلاحیت استاذ کی حیثیت سے طلبہ کو فائدہ پہنچا رہے تھے۔ طلبہ ان کے درس سے مطمئن ہوتے اور مستفید ہوتے تھے لیکن ان کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ وہ اب مجبور ہو کر یہاں سے سلسلۂ تدریس منقطع کر رہے ہیں اور اپنے گھر جا کر دوسرے ادارے سے وابستہ ہونے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں اب ہمارے لئے سوائے چارہ کار نہ تھا کہ موصوف نے اپنے طور سے جو طے کیا ہے اسے بادل ناخواستہ منظور ہی کیا جائے اور اس جدائی پر صبر ہی کیا جائے۔" صدر محترم نے مزید فرمایا: "اب ہم اس بات کے خواہشمند ہوں گے کہ موصوف یہاں سے جانے کے بعد قلبی تعلق برقرار رکھیں گے، ادارہ کے لئے دعا گو رہیں گے اور اپنے مشوروں سے بھی نوازتے رہیں گے، اور جہاں بھی رہیں ایک کامیاب مدرس کی حیثیت سے اور ایک مبلغ کی حیثیت سے کام کرتے رہیں۔" صدر محترم نے آخر میں فرمایا: "موصوف ہمارے یہاں کافی دن مقیم رہے، لہٰذا بشریت کا تقاضا ممکن ہے اور عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ مجھ سے یا میرے ساتھیوں سے موصوف کو کوئی تکلیف پہنچی ہو یا خدانخواستہ ان سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو تو ایسے موقع پر جب کہ وہ ہم سے جدا ہو رہے ہیں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہماری اس طرح کی

تقصیرات سے اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائیں گے اور جہاں بھی رہیں گے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ ہم ان کے لئے آئندہ زندگی کے لئے کامیابی کی دعا کرتے ہیں۔"

صدر محترم کی گفتگو کے بعد استاذ محترم کی باری تھی۔ آپ کھڑے ہوئے، اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ایک مرتبہ اساتذہ کی طرف نظر ڈالی، کچھ دیر خاموش رہے۔ شاید وہ اپنے جذبات کے سیلاب کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ اس سیلاب کو نہ روک سکے اور چند جملے کہہ پائے تھے کہ [illegible] ہو گئے اور آخر تک یہی کیفیت طاری رہی اور آپ نے سسکتے ہوئے فرمایا: "معزز اساتذہ کرام، محترم ساتھیو اور عزیز ترین طلبہ جامعہ! میں اپنے آپ کو اس وقت اس حالت میں نہیں پاتا ہوں کہ آپ لوگوں کے سامنے کچھ کہہ سکوں۔ [illegible] چند سطر پہلے سے تیار کر رکھی تھی لیکن وہ بھی نہ ہو سکا۔"

استاذ محترم نے جامعہ کو اپنی مادر علمی کہا۔ آپ نے فرمایا: "جامعہ اور متعلقین جامعہ کے احسان سے میں کس طرح سبکدوش ہو سکتا ہوں۔ جامعہ میری مادر علمی ہے۔ [illegible] کی حیثیت سے [illegible] مجھے یہ کہنے کی جرأت تو نہیں ہو رہی ہے کہ اپنی مادر علمی سے جدا ہو رہا ہوں، اگرچہ جدائی صرف ظاہری اور قانونی ہے [illegible] مجھے [illegible] ہمیشہ [illegible] سے قلبی عقیدت رہی ہے اور رہے گی [illegible] آخری آرام گاہ تجویز کی .... یہ حقیقت ایک طرف اور ــــ جدائی کا غم دوسری طرف۔"

استاذ محترم نے مزید فرمایا: "میں اپنی مجبوریوں کو کیسے گناؤں، جدائی کا جذبہ کیا ہوتا ہے؟ [illegible] ہے کہ [illegible] تقریباً ۱۵ سال کے عرصہ میں جب کہ ہمارا ایک ساتھ رہنا سہنا [illegible] ہے مجھ سے دانستہ اور نادانستہ طور پر گستاخیاں ہوئی ہیں اور یقیناً ہوئی ہیں۔ میں ان کے لئے تہہ دل سے معافی کا طلبگار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات ضرور معاف فرمائیں گے۔ اپنے بھائیوں کی طرف سے اگر مجھے کوئی تکلیف پہنچی ہے تو وہ وقتی تھی۔ میں نے اس کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام لوگوں کو معاف فرمائے۔"

استاذ محترم نے آخر میں دعا کرتے ہوئے فرمایا: "اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔ ہم تمام لوگوں کے درمیان آپس میں محبت دے اور ہم سب کے اندر ایک ٹیم اسپرٹ پیدا کرے تاکہ ہم تمام لوگ جامعہ کی ہمہ گیر ترقی میں معاون و مددگار ہو سکیں۔"

بحمد اللہ استاذ محترم نے جس طرح تنہا اس ادارے کو ظاہری اور معنوی حیثیت سے تعمیر کیا ٹھیک اسی طرح عملاً بھی اسے کر دکھایا۔ آپ کا یہ کام ہے کہ اپنی جامعہ اور اساتذہ سے ملاقات کرنے آتے رہتے ہیں اور اپنے طلبہ کو ملاقات کا شرف بخشتے رہتے ہیں کہ جب یہ احساس ہوتا ہے۔ نہیں ہوتا کہ استاذ محترم ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ تعلق ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین ثم آمین۔

انجمن طلبۂ قدیم کی مقامی شوریٰ اور فلاحی برادران کی نشستیں

اس سے پہلے جنوری ۱۹۸۸ء کے شمارے میں آپ سب کو یہ خبر پہنچ چکی ہوگی کہ مقامی شوریٰ اور عام فلاحی برادران کی نشستیں مسلسل منعقد ہو رہی ہیں۔ بحمد اللہ یہ سلسلہ شدت سے جاری ہے۔ وقتاً فوقتاً مقامی شوریٰ کی نشستیں ہوتی رہتی ہیں اور گاہے بگاہے عام فلاحی بھائیوں کی نشستیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی ۵ جنوری ۱۹۸۸ء کو بعد نماز عصر جامعہ کی مسجد میں عام فلاحی بھائیوں کی ایک اہم نشست ہوئی۔ اس نشست کا آغاز جناب مولانا حافظ احسان الحق صاحب فلاحی کی تذکیر سے ہوا۔ اس کے بعد چوتھے دو سالہ اجلاس سے متعلق کاموں کی تقسیم پر تبادلۂ خیال ہوا اور تقریباً اکثر شعبہ جات کے ذمہ دار مقرر کر دیے گئے۔

ایک دوسری قابل ذکر نشست ۱۹ جنوری ۱۹۸۸ء کو رکھی گئی۔ یہ نشست بھی عام فلاحی بھائیوں پر مشتمل تھی۔ اس نشست کا موضوع بھی انجمن کا چوتھا دو سالہ اجلاس ہی تھا۔

ایک تیسری اہم نشست ۱۹ جنوری ۱۹۸۸ء کی صبح کو جامعہ کے دفتر میں رکھی گئی۔ اس نشست میں بھی اجلاس سے متعلق اہم امور پر تبادلۂ خیال ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہماری کوششوں کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔

انجمن طلبۂ قدیم کی جانب سے طلبہ وطالبات کو ایک قیمتی انعام دیے جانے کا فیصلہ

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح نے اس سال مختصر تفسیر ابن کثیر کا مکمل سیٹ بطور انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ انعام عربی پنجم، عربی ششم اور عربی ہفتم کے فلاحی طلبہ کے مضمون میں سب سے زیادہ نمبرات حاصل کرنے والے طالب علم کو دیا جائے گا۔

اور شعبۂ نسواں میں عربی چہارم اور عربی ششم کی لڑکیوں کے قرآن کے مضمون میں سب سے زیادہ نمبرات

حاصل کرنے والی طالبہ کو دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

شعبۂ نسواں (کلیۃ البنات) میں لائبریری کا قیام

کلیۃ البنات میں کافی دنوں سے ایک لائبریری کی کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ بحمد اللہ جناب مولانا رحمت اللہ اثری صاحب کی تحریک پر ۲ جنوری ۱۹۸۸ء کو لائبریری کا قیام عمل میں آگیا ہے۔

واضح ہو کہ لائبریری کے سلسلے میں شعبۂ طلبہ کے ذمہ دار جناب مولانا حافظ احسان الحق صاحب اور معاون حافظ شمیم فلاحی صاحب منتخب کیے گئے۔ طلبہ و اساتذہ نے بھی لائبریری کے قیام میں کافی تعاون کیا ہے۔ جزاہم اللہ عنا احسن الجزاء۔

جناب مولانا محمد سلامت اللہ صاحب اصلاحی کی بحیثیت استاذ جامعہ آمد

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جناب مولانا محمد سلامت اللہ صاحب اصلاحی دوبارہ بحیثیت استاذ جامعۃ الفلاح تشریف لا چکے ہیں۔ یہ صرف طلبہ جامعہ پر اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور ان کی دعاؤں کے قبولیت کا ایک مظہر ہے۔ الحمد للہ علی ذلک۔

مولانا نے مدرسۃ الاصلاح سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد تقریباً دس سال تک جامعۃ الفلاح میں استاذ کی حیثیت سے قیام کیا۔ پھر مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر حجاز کا رخ کیا اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے داخلہ لیا۔ وہاں آپ نے ایم اے کی سند حاصل کی۔

اس کے بعد جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ میں داخلہ لیا اور ماجستیر مکمل کیا۔

اب ایک طویل عرصے کے بعد دوبارہ اپنے طلبہ و اساتذہ کے درمیان واپس آ گئے ہیں۔

چوتھے دو سالہ اجلاس کے ذمہ داران کا انتخاب

۵ جنوری ۱۹۸۸ء کو بعد نماز عصر جامعہ کی مسجد میں عام فلاحی بھائیوں کی ایک نشست رکھی گئی۔ اس نشست میں چوتھے دو سالہ

اجلاس کے جملہ شعبہ جات کے ذمہ داران کا انتخاب عمل میں آیا۔ ذمہ داران مندرجہ ذیل ہیں:

شعبہ جات کی تقسیم

نمبر شمار	شعبہ جات	ذمہ داران	معاونین
۱	شعبۂ مالیات	مولانا نور محمد صاحب	مولانا اظہار احمد صاحب
۲	استقبالیہ	" " "	" ابوذر صاحب، جناب قطب عالم صاحب
۳	نشر و اشاعت	" مطیع اللہ "	" حافظ اسمٰعیل صاحب
۴	قیام گاہ	" محمد عمران "	" بدر عالم صاحب، مولانا عبد الباری صاحب
۵	مطبخ	" اظہار احمد "	" محبوب عالم صاحب، مولانا احسن الاثری قمر "
۶	اسٹیج انیٹ اجلاس گاہ	" محبوب عالم "	" حامد علی ساغر صاحب، مولانا اثیر احسن فلاحی "
۷	بیرون جات سے مہمانوں کی ضیافت	" نور محمد "	" علی مرتضیٰ صاحب، مولانا عبد الرحمٰن خالد صاحب
۸	والنٹیرس	" ابوذر "	" کمال الدین صاحب، مولانا محمد ذکریا حق احمد صاحب، مولانا حافظ محمد ماجد صاحب
۹	روشنی اور لاؤڈ اسپیکر	" غفران احمد	" امیر فیصل صاحب
۱۰	راشن نیز و تعاون کی وصولی	" جمیل احمد "	" عرفان احمد "
۱۱	پلاننگ	ولی اللہ سعیدی فلاحی	" احسن الاثری قمر "

بقیہ: الوداع اے ۱۹۸۷ء......

الارم کی آواز ختم ہو چکی تھی۔ ۱۹۸۷ء روانہ ہو چکا تھا۔ ۱۹۸۸ء شروع ہو چکا تھا۔ دنیا نے پھر سوچنا شروع کیا دو سوپر پاورس SUFER POWERS امریکہ اور روس کے درمیان جو جوہری معاہدہ ہوا ہے وہ بڑا خوش آئند ہے۔

امید ہے کہ ۱۹۸۸ء خوشحالی اور امن کا نقیب ثابت ہو۔ ●●

ماہنامہ مجلہ

"حیاتِ نو"

کی

ایک اہم پیش کش

اجلاس نمبر

جلد ہی منظرِ عام پر آنے والا ہے

یہ نمبر انجمن طلبۂ قدیم کے چوتھے دو سالہ اجلاس کی مکمل رپورٹ پر مشتمل ہوگا، مزید برآں سیمینار میں پیش ہونے والے قیمتی مقالات بھی شامل اشاعت ہوں گے۔

خواہش مند حضرات ہمیں فوراً مطلع فرمائیں اور ایجنٹ حضرات مطلوبہ کاپیوں سے آگاہی میں تاخیر نہ کریں۔

منیجر

ماہنامہ مجلہ "حیاتِ نو" جامعۃ الفلاح، بلریاگنج اعظم گڑھ۔ یوپی ۲۷۶۱۲۱